دل کسی کا
دوست نہیں

دل کسی کا دوست نہیں

بار	اوّل
تعداد	ایک ہزار
تاریخ	ستمبر ۱۹۵۹ء
قیمت	۴ روپے
پروڈکشن	گورمیر سنگھ
سرورق	
کتابت	
مطبوعہ	

کرشن چندر

دل کسی کا دوست نہیں

ناشر

مہندر ناتھ

پبلیکیشنز

۵ بہار گولفین تیس ہزاری

دلّی

HaSnain Sialvi

افسانے

پریتو

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اُس کے چلنے
کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔ اُس کی
شخصیت بڑی پُر وقار تھی۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ رنگ سُرخ و سپید۔
براق نُورانی داڑھی۔ اُس نے کالی مرچ کے رنگ کا اُونی سُوٹ پہن
رکھا تھا۔ اور سر پر مونگیا رنگ کی پگڑی کس کر باندھی ہوئی تھی۔ اور
ڈبے کے درمیان روشنی میں اُس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے
ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اُٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا
متوازن قدم اُٹھاتا ہوا میرے قریب آ کر رُکا۔ جُھک کر اُس نے قریب
کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔
سیٹ اُس کے وزن سے پیچھے کو ہو گئی۔ اُس نے مزید اطمینان کی سانس
لی اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ پیچھے کو ہٹنے والی کلدار نشستیں بہت
عمدہ ہیں!"

میں نے اپنا جلتا ہوا سگرٹ جسے میں نے ابھی ابھی سُلگایا تھا جلدی

سے خاکدان میں بجھا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور
اُس نے کہا "شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت برا معلوم ہوتا ہے!"
مجھے اُس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔
بے حد سپید اور مضبوط دانت، جڑے جڑے اور ہم سطح۔ اُس بوڑھے
فوجی سکھ کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں
میں اب بھی جوانی کی چمک اور اُس کا تجسس پایا جاتا تھا۔ اِس عمر میں
بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی
شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک
رہا ہوگا۔ اِس وقت اُس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد
زخموں کے نشان تھے۔ دائیں بائیں اُس کے رخساروں پر تین چار
لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے
ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی۔ اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی وی V
کا سا نشان بنائے تھے۔ اور جب اُس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کیلئے
ہاتھ اوپر کئے تو میں نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی
زخموں کے ایسے چھوٹے چھوٹے بیسیوں نشان ہیں۔ جیسے کسی نے تیز
دھار کے چاقو سے اِن ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش کی ہو۔
جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے

کس محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ اس خوبصورت اور وجیہ انسان کی بانہہ یا ٹانگ نہیں کٹی۔ ورنہ کتنا بُرا معلوم ہوتا یہ آدمی!

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا، کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آ کر کہا کہ اب آپ لوگ آ کے کھانا کھالیں۔ ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کردیتے ہیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بوڑھا سکھ بھی میرے ساتھ اُٹھ گیا۔ "حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کے چلا تھا مگر اسوقت پھر محسوس کر رہا ہوں۔" بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اور میں اس لئے دیر میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی!" میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا۔ اور کھڑکی سے باہر رُک رُک کر پورن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دباتے ہی لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھِل اُٹھتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا

جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (switch) ہے. کہ جیسے بار بار دبانے سے یہ مُسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی لڑکی کے بال خوشنما طریق سے کٹے ہوئے تھے۔ اور وہ بڑی دلرُبا صورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی۔ اور شکل وصورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچین معلوم ہوتی تھی جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا مراٹھا، چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا۔ گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اُس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اُس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے۔ اور اُس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں!

لڑکی کا ایک ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اُسے اِس طرح دباتا تھا جس طرح گویا وہ اُس میں برقی رَو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اُس لڑکی کی نیلی ساڑی کا پلّو برابر مسکے جا رہا تھا۔ اور اُس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اِس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی لڑکی نہ ہو مٹن کی ایک پلیٹ ہو۔

"محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے" میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا۔ اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر اور بل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اُس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ، اُس کے تبسّم کی ادا بے حد پسند آئی۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی۔ کتنی چاہت اور سپردگی تھی اُس کی نگاہ میں۔ کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے۔ اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے! بس اُسی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے مُسکرانے کے بعد کچھ اِس طرح کی نگاہ سے اُس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر ٹھٹھک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور نوجوان اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے ڈیٹی بول میں لے گیا تھا۔ اور اُن کے جانے کے بعد ریستوران کار اور بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی۔ اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف اُنھیں کیلئے لٹکایا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بُوڑھا سِکھ میری حرکت پر مُسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بُوڑھے سِکھ نے کافی منگائی اور میں سگرٹ پینے کے لیے باہر ویٹی بیول میں آگیا۔ ویٹی بیول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اُس لڑکی کو چُوم رہا تھا۔ اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پُوچھا۔ یہ آنسو کیسے؟

یونہی یونہی! لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی اور پھر کھِلکھِلا کر ہنس پڑی۔ اور اُس کے چہرے پر پھر وہ دلآویز تبسّم آیا۔ مَن مُوہنا، محبّت میں ڈوبا ہوا، گُلنار تبسّم!

لڑکے نے پھر اُسے ایک بار چُوما۔

لڑکی کے شانے کانپے۔ اُس نے ٹھِٹھر کے کہا "چلو ڈارلنگ اندر چلیں۔ یہاں سردی ہے! اور" . . . اُس نے خاموشی سے اپنی نگاہوں سے میری طرف اِشارہ کیا، میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پُورنیما کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا مجھے ابھی چھُرا بھونک دیگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے گھُوم لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اُسے ویٹی بیول سے نکال کر اندر ڈبّے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بُوڑھا سِکھ بھی کافی پی کر ریستوران کار سے نکلا، میں نے بھی اِتنے میں اپنا سگرٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس اپنے ڈبّے میں آکر اپنی سیٹوں پر دراز ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبّے میں آیا۔ اُس نے سب بتیاں بُجھا دیں لیکن ڈبّے کے باہر چاندنی مکمّل طور پر کِھل اُٹھی تھی۔ اور اُس کی سپید مدھم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور سہمے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا "مجھے اِس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا دوں؟"۔

"ذرا ٹھہرو" بُوڑھے سِکھ نے بہت ہی دھیمے لہجہ میں بے حد پُرسوز آواز میں کہا۔ "یہ پُونم کی رات بہت بھیانک ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے۔ مجھے اِس سے ڈر لگتا ہے۔ مگر میں اِسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اِس چاند کو دیکھ لوں؟"

"چاند کو تو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں، ہمارے تمہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں"۔ میں نے افسردہ تبسّم کے ساتھ کہا۔

بُوڑھا سِکھ مُسکرایا۔ اُس کا دایاں رُخسار چاندنی میں تھا۔ اور صلیب کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رُخسار کی "وی"

تاریکی میں گم تھی۔

میں نے کہا: "تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کئے ہیں؟ جنگ"؟ ———

بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں! جنگ ہی تو تھی"۔ وہ رک کر آہستہ سے بولا۔

"کونسی جنگ؟ پہلی جنگِ عظیم یا اس سے پہلے کی کوئی جنگ"؟ میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا۔ بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا۔ میرا قیاس بے بنیاد ثابت ہوا، اس لئے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا پھر یہ زخم کیسے؟

بوڑھے سکھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا۔ کھڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے۔ مگر جہاں تھے وہیں کے وہیں اپنی اپنی آرام کرسیوں پر دراز سو رہے تھے۔ ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر ڈبے کے آخر میں تاریک کونے میں وہ لڑکا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے ہوئے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا۔ اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر۔ آنکھیں دونوں کی بند تھیں۔

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ قصہ ضرور سنو گے؟"

"اگر تمہیں نیند نہ آرہی ہو تو سُنا دو۔"

"نیند تو مجھے اِس چاندنی میں کبھی نہ آئے گی!" بوڑھے سردار نے بڑے گداز لہجے میں کہا۔ پھر اُس نے اِس طرح مجھ سے کہا جیسے وہ قصّہ سُنانے کے لئے تیار ہو چکا ہو۔ اُس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ "اچھا تو سُن لو۔ تم میرے لئے مکمّل اجنبی ہو اِس لئے تمہیں سُنا دینے میں کوئی ہرج نہیں"۔ گاڑی کی کھڑکیوں میں وہ ہرے شیشے لگے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے گاڑی کی جھک جھک بڑے میٹھے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور گاڑی کے دو رُویہ پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹے ہوئے، سر جھکائے ہوئے گناہ گار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوئے ہوئے مرابٹے نوجوان کی طرف اِشارہ کر کے کہا "جوانی میں میں بھی اِسی طرح تھا۔ بے فکر اور لاپرواہ اور خود سر۔ میرا باپ گجندر سنگھ موضع حاصلاں کا نمبردار تھا۔ اور اِس کے علاوہ چک نمبر ۳۷ بھی پُورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو باپ نے مجھے بی اے پاس کرایا تھا۔ لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشاق تھے۔ جانے میں نے

بی اے کیسے کر لیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں، کرنیل بنوں، مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹّی کی سوندھی مہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دُور دُھراں کے ٹیلے پر پانی بھرتی ہوئی بانکی ناریوں کی قطار، اور میری سُنہری گھوڑی کی ڈُلکی چال، کچّے راستوں پر ہلکی ہلکی دُھول جگاتی ہوئی ...... آہ!

میں نے کہا۔ "تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہو گے، عورتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی۔"

بوڑھے سکھ نے ایک حزیں مُسکراہٹ سے کہا۔ "ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی لڑکی نے مجھ سے محبّت کی ہو۔ ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبّت کی تھی۔"

"کون تھی وہ؟"

"میری بیوی تھی!"

بیوی؟ ——— میں نے بے حد نا اُمید ہو کر کہا۔ کمبخت نے سارے رومانس کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔

"ہاں، جب میں بی اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جُھمراں کے نمبردار کی لڑکی پرینو سے میرا بیاہ کر دیا۔ پرینو

بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ لانبی اور بانکی گوری اور سُنہری۔ چکیلی اور نرم جیسے کوار گندل مگر میں تو اُس کی آنکھوں پر مرتا تھا۔"

"کیوں اُن آنکھوں میں کیا خاص بات تھی؟" میں نے پوچھا۔

"بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔"

پھر کیا بات تھی؟

کہہ نہیں سکتا۔ اُن آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں، اُن آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

وہ آنکھیں بولتی تھیں؟

بولتی تو نہیں تھیں۔ لیکن بولنا چاہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سپنا سا دیکھا کریں۔؟

جوانی میں سبھی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں میں نے کہا۔

"ہاں! لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں! بڈھے نے آہستہ سے کہا۔ میں تو پریمی پرتو پر مر مٹا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لئے ہوا کہ میری زندگی میں اُس سے پہلے کوئی عورت نہ آئی تھی۔ نہ اُس سے

پہلے نہ اُس کے بعد۔ پر تم نے نہیں دیکھی، ورنہ یوں نہ کہتے، وہ تو ایسی عورت تھی جس سے اُس کے بیوی ہونے کے بعد بھی اُس سے عشق کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر یوں ہی ہوا۔ جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوراً میرا بیاہ کر دیا۔ اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اُسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہو گی، مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں اِٹلی میں یا فرانس میں یا میسوپوٹیمیا، یا درۂ خیبر میں کہیں نہ کہیں اُن لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی۔ حالانکہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا بُرا ہوا۔"

یکایک وہ چُپ ہو گیا۔

میں بھی چُپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا "قصّہ مختصر یہ کہ میں اپنی پریتو کو بہت چاہتا تھا۔ اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ اور ہم کبھی ایک دن کے لئے بھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتے تھے۔ لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسرا اپنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا۔ اور پریتو کو اپنے میکے جانا پڑا۔ اُس کا باپ بیمار تھا اِس لئے میں بھی اُسے کیسے

روک سکتا تھا۔ چنانچہ پریتو چلی گئی۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں، کھیتوں میں، اپنی گھوڑ سواری میں، کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے، لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سرپٹ ہو لیا۔ اپنی سسرال کے گھر۔ چک جھمراں ہمارے گاؤں سے تیس کوس پر واقع ہے۔ لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار تھی۔ میں شام ہوتے ہوتے چک جھمراں پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ بلکہ میں نے اُسے خاصا ہشاش بشاش پایا۔ ساس اور سسر دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور جب اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی صحت پوچھنے چلا آیا ہے، تو وہ میری سعادت مندی پر بے حد خوش ہوئے۔ دن بھر تیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا۔ اِس لیے جلدی کھانا کھا کے میں سو گیا۔ مجھے معلوم تھا اب جو سوؤں گا تو پھر صبح ہی اُٹھونگا۔ میں نے پریتو سے کہا مجھے صبح ضرور اُٹھا دینا۔ میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح سیر کو جاؤں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اُس رات تیسرے پہر ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے۔ دُور کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھلنے اور پھر بند

ہونے کی آواز آئی، اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گذرتا ہوا معلوم
ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا۔ واھگورو یہ کیا ماجرا ہے ـــــــ؟
سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھا۔ کرپان کو تکئے کے نیچے
سے نکال کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی
چاندنی رات تھی۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں
میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کرتیں مگر ان کے جڑے
فوراً اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونگ مار کر انھیں اپنی گود میں دبا لیتے۔
میرے پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے۔ اور میرے چاروں طرف
سرسوں کی ہری ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں۔ اور کھیتوں میں گذرتا
ہوا اپنی پریتو کے تعاقب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا وہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ
ہونے جا رہی ہے۔ لیکن جب اُس نے ایک کھیت کو پار کر لیا۔ دوسرے
کھیت کو پار کر لیا۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم کر نیچے کے
خشک نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی تو مجھے کچھ
عجیب طرح کی تشویش، حیرت اور کوفت سی ہونے لگی۔ دِل کو
دھچکا سا لگا اور اب میں ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اُسکے

تعاقب میں چلنے لگا، تاکہ اُسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اُس کے تعاقب میں ہے۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اُتر کر میں نے نالے کو پار کیا۔ پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی

سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سائے دار جھاڑ تھا۔ جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب ایک نا پختہ گھر تھا۔ جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اُس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پریتو۔ میری بیوی اُس سے بہت پیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اُس کی آنکھیں چومتی اور اُس کے رُخسار۔ اور کتنی شدّت تھی اِس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ مگر میں چپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا اُن لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

ہاں! ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پریتو! مجھے پیاس لگی ہے، اندر سے پانی لا دے!

پریتو نے اپنا سر اُس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی بچے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا۔ اُس نے میری بیوی کے ہونٹ چُوم لیئے۔ پریتو آہستہ سے پلنگ سے اُٹھی اور آدھ کُھلے دروازے سے نابُختہ مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے مُنہ لیٹ کر بڑے اِشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی۔

یکایک میں نے کرپان نکالی اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر سر کے اوپر اُٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا۔ بچنے کے مُنہ سے "ھک" کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اُس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں سے گذرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لئے رُک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا۔ اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی تو اُسے میان میں رکھ کر گھر کے اندر آ گیا۔ اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھے پون گھنٹے کے بعد پریتو میرے کمرے میں دھیرے سے داخل ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پریتو نے دروازہ کھول کر پہلے

تو مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اُس نے آہستہ سے میرے تکئے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اُسے کھول کر دیکھا۔ اور جب اُسے بالکل صاف شفاف پایا تو گویا اُس کے دِل کا شبہ دُور ہو گیا۔ اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی۔ چُپ چاپ۔ پتھر کی سِل۔

بُوڑھا سِکھ چُپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پُوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"۔

"کچھ نہیں ہوا! اُس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اِس لئے میں پریتو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا۔ اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔"

دِن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے، میں نے کبھی اُس بات کا اُس سے تذکرہ نہیں کیا۔ نہ پریتو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُسے کِسی بات کا بھی شبہ ہوا تھا۔ یا اُسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی۔ اِس واقعے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی۔ میرے کہنے پر یا اپنے ماں باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اِس واقعے کو بھُول سا گیا۔ کیونکہ اب ہمارے بچے ہو گئے تھے۔ میرے اور پریتو کے بچے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔

بڑے خوبصورت بچے تھے ہمارے۔ پرتاپ اور دلیپ اور پرنام کور۔ بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے۔ اور سکول جانے لگے۔ سکول سے کالج میں جانے لگے۔ اور جب وہ کالج جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہربنس سنگھ۔ اب ہمارے ہرے بھرے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت۔ جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کے مگھ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ اور دلیپ کالج سے واپس آ گئے تھے۔ گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے لئے۔ پرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پریتو مگھ کے نیچے ایک کونے میں چولہے میں مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ اُبل رہا تھا۔ اور اُسکی کھٹی کھٹی خوشبو میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کرپان کھول کر الگ رکھدی۔ اور ہاتھ منہ دھو کر پریتو کے سامنے مونڈھا بچھا کر بیٹھ گیا۔ اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

"پریتو جلدی سے کھانا دے دے"!

پربتو نے سب سے پہلے میرے لئے کھانا پروسا۔ پھر پرتاپ کے لئے۔ پھر دلیپ کے لئے، پھر ہرنام کور کے لئے۔ سب سے چھوٹا ہربنس نے مچل کر کہا۔ "میں تو ماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

میں نے پربتو سے کہا تو بھی بیٹھ جا اب!

"میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟" پربتو نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا۔

اس وقت چولھے کی روشنی میں اس کے رخسار تمتما اٹھے تھے، اور الجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آئی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے۔" دلیپ نے اپنی تھالی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

پربتو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کڑچھی بھر کر اسے دلیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔

"میں نے کہا۔ ہربنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزہ دونا ہو جائے۔"

"اچار تو اندر کوٹھری میں ہے!" پربتو نے رک رک کر کہا۔

"تو کیا ہوا۔ اندر سے جا کے لا دے!"

پربتو سہم کر بولی۔ "اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے۔ مجھے

ڈر لگتا ہے!"

"ڈر لگتا ہے؟" یکایک میرے مُنھ سے بے اختیار نکلا۔" اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن اُس رات کو کھیتوں کو پار کرکے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا" ؟ یکایک میں نے تنک کر کہا۔ جانے کیسے کہہ دیا۔ اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا۔ کیسے وہ بات یوں ایک طعنہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آگئی۔

پریتو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان لئے میرے سر پر کھڑی ہے۔ پھر ایک بجلی سی تڑپی۔ اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ اوپر اُٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار، کرپان میرے رُخساروں کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے ہاتھوں سے اُسے رُوکنا چاہا۔ اور چلایا۔ پریتو، پریتو! رُک جا۔ مگر پریتو ایک بھُو کی شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کرپان اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اُٹھا کر اور اپنے جسم اور رُوح کی پُوری طاقت سے پریتو کی گردن پر بھرپور وار کردیا۔ پریتو کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری۔ اور وہاں سے لڑھک کر میری تھالی میں اوندھی ہو گئی۔ اور اُس کے سیاہ بال

کھُل کر میرے سامنے بکھر گئے۔

بُوڑھا سکھ چُپ ہو گیا۔

میں بھی چُپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشتناک بھُوت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مُسافروں کے چہرے سپید اور سُستے ہوئے تھے۔ جیسے وہ چہرے نہ ہوں بہروپیوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گُزرتی ہوئی کِسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور چاند۔ مجبور اور بے کس تنہا اور اکیلا، کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بُوڑھے سکھ نے دِلگیر لہجے میں کہا۔

"عورت کبھی نہیں بولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اُسے ایک ڈولی میں سوار کرا کے، ایک پلنگ پر لِٹا کر، چار بچے پیدا کرا کے، اُس کے دِل کا سپنا اُس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے!"

عورت کبھی نہیں بھُولتی!

بُوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اُس نے اپنے رُخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اُس کے دل کے اندر ڈوب چُکی ہے!۔

گاڑی میں اِس قدر سنّاٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس

ہوئی۔ میں نے مُنھ کھول کر دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لئے۔ پھر
اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا ہاتھ
ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ اور لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے
شانے پر تھا، اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ اور دونوں سو رہے
تھے۔ یکایک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اُٹھایا۔ آہستہ سے اپنا
ہاتھ لڑکے کے نیچے سے نکالا، اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اُسے
اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سُو رہا ہے، تو لڑکی نے نوجوان کا
بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اُس سے مُنھ پھیر کر چاند کی طرف
دیکھا۔ پھر ایسی حسرت آمیز التجا سے دیکھا جو اُس کی گلنار مسکراہٹ
کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی۔ میں بالکل بھونچکّا رہ گیا۔ یکایک
میرے ذہن میں ایک کرپان سی لہلہاتی ہوئی محسوس ہوئی اور
میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں!

دوسرے لمحے میں جب میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے
اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا۔ اُس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں
اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رُو رہی ہے!

گُل دان

گل دان

برگا نزا کی خفیہ بار سے جب میں اور میرا جھگی داڑھی والا مصوّر دوست گمٹے پی کر نکلے تو ہم دونوں کے پیروں میں سپرنگ لگ چکے تھے۔ لیکن گمٹے کے قدم مجھ سے کچھ زیادہ ہی لڑکھڑا رہے تھے۔ اور وہ ایک بدمست بکرے کی طرح نشے میں جُھبلتا دکھائی دیتا تھا۔ اور اُس کی پتلی جھگی ڈاڑھی بھی ہوا میں اُسی طرح جھولتی دکھائی دیتی تھی۔ حالانکہ گمٹے آج ہی اِس بار میں پہلی بار مجھ سے ملا تھا۔ لیکن ملتے ہی مجھے اِس کھلے انداز میں کچھ ایسے پیارے جھکّی انداز میں ملا کہ میں اُس سے بور ہوتے ہوئے بھی اُس کا قائل ہوگیا۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ مصوّر کیسا ہے؟ مگر اُس کی باتوں سے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ آدمی دلچسپ ہے اور باتونی اور جھکّی ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے۔ اور آج کل کے مشینی دَور میں تو اِنسان اِسقدر سپاٹ، غیر دلچسپ اور یکساں ملتے ہیں گویا ایک ہی ٹھپّے اور سانچے میں ڈھالے گئے ہوں۔ کرنسی نوٹوں کی طرح۔ صرف چہروں کا نمبر مختلف ہوتا ہے۔

اِس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں گمٹے کو اُس کے گھر تک پہنچا دوں۔

لیکن جب میں نے اپنا عندیہ اُس پر ظاہر کیا تو وہ بے حد خفا ہوا۔ ابے جا سالے

تو کیا سمجھتا ہے۔ میں اکیلا اپنے گھر نہیں جا سکتا۔" اس نے اتنا کہا پھر مجھ سے الگ ہو کر مخالف سمت کو دوڑنے لگا۔ گویا میری صورت سے بھی بے زار ہو چکا ہو۔ میں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ اور اسے دونوں شانوں سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ راستے میں جگہ جگہ پولیس جیپ ملے گی۔ مجھے تمہارا تو ڈر نہیں ہے۔ ڈر ہے وہ لوگ کہیں تمہاری یہ خوبصورت بُش شرٹ نہ اتار لیں۔"

برگانزا کی بار میں سب سے پہلے گمٹے کی بُش شرٹ نے ہی مجھے اپنی طرف کھینچا تھا۔ بڑی خوب صورت بُش شرٹ تھی۔ اُس کا کپڑا تو نہایت معمولی موٹا اور کھردرا تھا۔ لیکن اس پر مصوّر نے اپنے ہاتھ سے نقش و نگار ابھارے تھے۔ دونوں کالروں پر چیلوں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جب میں نے پوچھا یہ کیوں ہے؟ تو گمٹے نے جواب دیا۔ اس لئے کہ ہم غریب انسان کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ سینے کے مقام پر ایک نیم برہنہ عورت کی تصویر تھی۔ کیونکہ گمٹے کے خیال میں ہر مرد کے دل میں اگر وہ مرد ہے تو یہی ایک تصویر ہوتی ہے۔ دونوں جیبوں کے باہر کرنسی نوٹوں کی شبیہ مقدس تھی جس کے بارے میں مجھے بھی مزید استفسار کرنا تضیع اوقات معلوم ہوا۔ گہرے سبز رنگ کی بُش شرٹ کو پہن کر جب گمٹے شام کے وقت باہر نکلتا تو ہر راہ گیر کی نگاہیں اس پر پڑتیں۔ بلا مبالغہ پورے شہر میں اور کسی کے پاس ایسی نادر بُش شرٹ نہ ہوگی۔ میرا جی بہت چاہا کہیں

گمٹے کے بدن سے یہ بُش شرٹ اُترو الوں۔ مگر پہلی ہی مُلاقات میں اُس سے اِس قِسم کی جسارت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

گمٹے کو اپنی بُش شرٹ پر بڑا ناز تھا۔ وہ بے حد اپنائیت سے اُسکی طرف دیکھ کر بُولا۔

کیوں؟ پولیس والے میری بُش شرٹ کیوں اُتاریں گے؟

میں نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اِسے پہن کر تم عُریانی کا اشتہار معلوم ہوتے ہو"

"تو وہ میری بجائے ایلورا اور کھاجو راؤ کے مندروں کو کیوں گرفتار نہیں کرتے؟"

گمٹے نے چڑ کر میرے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے جھٹک دئے اور منہ بسور کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ اِتفاق سے ایک خالی ٹیکسی دھیرے دھیرے جا رہی تھی۔ گمٹے نے فوراً ہاتھ سے اِشارہ کر کے اُسے رُوک لیا۔ ہم دونوں خاموشی سے اُس میں بیٹھ گئے۔ گمٹے نے لہرا کے کہا۔ کماٹی پورہ نو نمبر کی گلی۔ سات نمبر کی چال!

"بہت اچھا بادشاہو" ٹیکسی والے پنجابی نے بھی لہرا کے کہا۔ اور ٹیکسی تیز کر دی۔ وہ بھی پئے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹیکسی کو

سڑک سے اُٹھا کر ٹرام کے پٹے پر چلانے لگا۔ اور تار، ٹیلی فون اور بجلی۔ ٹرام کے کھمبے آپس میں یوں گڈ مڈ ہونے لگے کہ میں نے چلّا کے کہا "ٹیکسی روکو! ٹیکسی روکو!"۔ ٹیکسی والے نے گنگناتے ہوئے زور سے بریک لگائی۔ ٹیکسی جھولتے ہوئے ایکدم رُک گئی۔ ٹیکسی والا مجسّم سوال بنا ہوا میری طرف دیکھنے لگا۔ کیسے ٹھیک بھی!

میں نے کہا: "تم ٹیکسی کہاں چلا رہے ہو؟"

"سڑک پر"!

"مگر یہ تو ٹرام کا پٹّہ ہے"۔

"تو کیا ہوا سڑک تو یہ بھی ہے۔ اور میں تو اس وقت ٹیکسی کو ٹرام کے پٹّے پر تو کیا ہوا میں بھی چلا سکتا ہوں"۔

"اس میں کیا شبہ ہے" میں نے سنجیدگی سے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا "لیکن ہمیں ٹیکسی کا سڑک پر چلنا ہی پسند ہے۔ اس لئے......!

میں چُپ ہو گیا۔

ٹیکسی والے پنجابی کو میری بزدلی پر سخت غصّہ آیا۔ مگر آدمی شریف تھا۔ اس لئے فوراً خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اُس نے ٹیکسی ٹرام کے پٹے سے ہٹالی۔ اور نیچے سڑک پر چلانے لگا۔ بے تحاشا تیز انداز میں۔

"دھیرے چلاؤ"۔

دھیرے چلانے والے کی ماں کی ـــــــ ٹیکسی والا منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اور اُس نے ٹیکسی کی رفتار اور تیز کردی۔ اور زور زور سے گنگنانے لگا۔

"اساں تینوں نئیں چھڈنا"۔ ہم تمہیں نہیں چھوڑینگے!
بھادیں وڈے دی قیدی بولے ۔ چاہے ایک برس کی قید ہوجائے!!

اِس گیت کے بول سُننے کے بعد کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے دِل ہی دل میں اپنی وصیت کی۔ اور اُس منظر کا تصوّر کرنے لگا۔ جب میری بیوی سرکاری مُردہ خانے میں میری لاش دیکھے گی۔ اور چھاتی پر دوہتّڑ مارکر کہے گی۔ "ہائے میرے بھولے خاوند! تم نے جیتے جی اپنی زندگی کا بیمہ تک نہ کرایا"۔

مگر اتفاق ایسا ہوا کہ راستے میں کوئی پولیس جیپ نہ ملی۔ اللہ تیرا فضل اور سَت گرو تیری اوٹ والی کوئی لاری نہ ملی۔ بوچڑ خانے کا ٹرک یا سرکاری ڈیری سے دُودھ لیجانے والا ٹریلر تک نہ مِلا۔ اور ہم لوگ چند منٹ میں کماٹی پورہ کی نونمبر کی سات نمبر کی چال کے باہر پہنچ گئے۔

ٹیکسی والے نے کھٹاک سے میٹر اُٹھاتے ہوئے کہا "دو روپے چودہ آنے"!
گمٹے نے اپنی بُش شرٹ کی دونوں جیبوں میں باری باری ہاتھ ڈالا۔ جہاں کرنسی نوٹوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ لیکن اندر سے ایک نوٹ

تو کیا ایک آنے کی ریزگاری تک بھی نہ دستیاب ہوئی۔ آخر میں نے دو روپے چودہ آنے دیکر جان چھڑائی۔ لیکن کمٹے نے میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اُلٹا مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "تم یہاں کیوں اتر پڑے۔ اِس ٹیکسی کو اپنے گھر کیوں نہ لے گئے؟"

اِس لئے کہ میں تمہاری تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں۔

"رات کے دو بجے ؟ جاؤ۔ جاؤ۔ مسٹر اپنے گھر جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر کمٹے اپنی چال کی طرف مُڑا۔ مگر مُڑتے ہی فٹ پاتھ کے کونے سے ٹکرا کر گر پڑا۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اُسے اُٹھایا۔ اور اُسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے سہارا دیکر چال کے چرخ چوں زینے پر چڑھنے لگا۔ تیسری منزل کے نمبر ۹ کونے پر اُس کا کمرہ تھا۔ میں نے کمٹے کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے کی کنجی ڈھونڈھ نکالی اور اُسے تالے کے سُوراخ میں گھمایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کمٹے نے کہا۔

"بائیں جانب دیوار پر بجلی کا سُوئچ ہے۔"

میں نے سُوئچ گرا کر روشنی کی۔ تو دیکھا سارا کمرہ تصویروں سے اَٹا پڑا ہے۔ مختلف سائز کی تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ کونوں میں پڑی تھیں۔ فرش پر رکھی ہوئی۔ عجب بے بسی کے عالم میں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ بلب کی روشنی کمزور تھی۔ اِس لئے وہ ہوا میں معلّق ایک زرد انڈا سا

معلوم ہوتا تھا۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں اِن تصویروں کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ تصویریں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ کہ یہ کون اجنبی ہے۔ جو ہم میں گھس آیا ہے۔ گمٹے کی تصویروں کے رنگ بڑے گہرے اور تڑپتے ہوئے سے تھے۔ لہراتے ہوئے کربناک رنگ۔ ایسے رنگ جو بیمار اور اعصاب زدہ معلوم ہوتے تھے۔ ایسے رنگ جو چڑچڑے اور جھکی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے رنگ جو طعنہ دیتے تھے۔ جو زندگی کی چکنی تہوں کے اندر کی کمزوری اور تکلیف دہ حقیقتوں کا سامنا کراتے تھے۔ اور ایک مضحکہ خیز انداز میں دیکھنے والوں پر ہنستے تھے۔ مجھے گمٹے کی تصویریں بالکل نہیں پسند آئیں۔ مجھے تو آبی رنگوں کا دھیما دھیما امتزاج پسند ہے۔ جب ایک رنگ غیر محسوس طریق پر دوسرے رنگ کی سطح میں گھس مِل جاتا ہے۔ جہاں درخت عورتوں کی طرح حسین ہوتے ہیں۔ اور عورتیں درختوں کی طرح ثمردار۔ جہاں مردوں کے جسم بانسری کے نغمے کی طرح لچکدار معلوم ہوتے ہیں اور بانسری کے نغمے کنول کے پھولوں کی صورت میں جھیل کے پانیوں پر نغمہ سرا معلوم ہوتے ہیں۔

"کیوں کیسی رہیں میری تصویریں"؟

میں نے مُڑ کر دیکھا۔ گمٹے کمرے کے وسط میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اپنی پھیلی ہوئی ٹانگوں سے فرش پر ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ اُس کی

اَدھ مُندی آنکھوں میں ایک عجیب ذہین چمک ہویدا ہوئی۔ ذہین اور طنز آمیز
میں نے ایک نظر اُس پر ڈالی۔ ایک نظر چاروں طرف تصویروں پر گھمائی،
اور بڑی بے خوفی سے کہا۔

"تم مصوّر نہیں ہو مسخرے ہو"!

"اِس میں کیا شُبہ ہے۔ اِ گمٹے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ میں مصوّر بعد
میں ہوں۔ کارٹون ساز پہلے ہوں۔ میں دِ نکرو یکلی کے لئے کارٹون بناتا ہوں۔
اور فُرصت کے اوقات میں مصوّری کرتا ہوں۔ اِس دُنیا میں یہ بات کتنی
عجیب ہے کہ جس کام سے اِنسان کو رُوٹی ملتی ہے۔ اُس کام سے اُسے محبّت نہیں
ہوتی۔ مجھے اکثر اُن لوگوں کے خِلاف کارٹون بنانے کو کہا جاتا ہے۔ جن کی میں
دِل سے عزّت کرتا ہوں۔ اس لئے اُن لوگوں کے کارٹون بناتے بناتے کئی بار
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ پر تھوک رہا ہوں۔ اور جب
سالہا سال اِسی طرح تھوکتے ہوئے گُذر جائیں تو اِنسان کا چہرہ مسخ
ہو جاتا ہے۔

گمٹے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر میری طرف اُنگلی
اُٹھا کر بولا۔ "اب اگر تم کسی گلی، بازار یا کسی مجمع میں سے گُذرو تو چہروں
کو غور سے دیکھنا۔ تمہیں اُن میں انسانوں کے چہرے کم اور تھوک دان
زیادہ نظر آئیں گے"!

میں نے گھبرا کر اپنے چہرے کو ہاتھ سے چھوا اور پھر فوراً ہی ہٹا لیا۔
اپنے آپ پر کچھ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ تمہیں اپنے کام سے اگر اتنی ہی نفرت ہے
تو اُسے چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔
گُمٹے نے ایک اُنگلی میری طرف اُٹھائی۔ بولا "نہیں تم غلط سمجھے۔ مجھے
کارٹون بنانے سے نفرت ہے۔ لیکن جب مجھے اپنی مرضی کے خلاف کارٹون
بنانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اُس وقت مجھے اپنے کام سے نفرت ہو جاتی ہے۔"
گُمٹے چُپ ہو گیا۔ یکایک اُداس ہو کر بولا "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں
مجھے کوئی ایسا کام کر لینا چاہیے جس میں مجھے سوچنا نہ پڑے۔ جیسے بازار
میں جھاڑو دینے کا کام۔"
اُس میں بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا "آدمی اگر سلیقے سے
جھاڑو نہ دے تو ہر راہ چلتے کے چہرے کو کارٹون بنا سکتا ہے!"
گُمٹے نے میرے مزاج کو نظر انداز کرتے ہوئے شدید کرب کے عالم میں کہا
"پھر میں کیا کروں؟ کیا میں گوبھی کا پتہ بن جاؤں۔ یا پیاز کا چھلکا؟"
اب میں کچھ سنجیدہ ہو چلا تھا۔ اِس لئے میں نے اُس سے تہدیدی انداز
میں کہا "حد سے بڑھی ہوئی قنوطیت کا مارا ہوا انسان گوبھی کا پتہ
بن سکتا ہے نہ پیاز کا چھلکا!"
پھر میں کیا کروں۔ گُمٹے جوش کے عالم میں اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑا

ہوا۔ اب اُس کے چہرے پر نشّے کا رنگ نہیں تھا۔ وہی گہرا تڑپتا ہوا رنگ تھا۔ جو اُس کی تصویروں کا تھا۔ اِس وقت مجھے وہ خود ایک تصویر معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے غصّے میں کہا۔

"اِس غلط کار دُنیا میں میرے ایسا انسان اپنے ڈھب کا کام کہاں سے ڈھونڈے؟ اپنی تخلیق کے درد کو۔ اپنے خواب کے بیٹے کو۔ اپنے جذبے کی معراج کو کہاں سے حاصل کرے؟"

"اِس کے مختلف راستے ہیں!" میں نے طنزاً کہا۔ "لیکن اُن میں سے کوئی راستہ برگانزا کے بار میں سے ہو کر نہیں گذرتا۔" میں ہنسنے لگا!

"مت ہنسو!" گمٹے جوش میں چلاّیا۔ "جب ایک گذری۔ تھکا دینے والی غلیظ ماحول میں رِستی ہوئی بِل سے ایک مزدور نکل کر گھر کی بجائے سیدھا تاڑی خانے کا رُخ کرتا ہے تو اُس کے تاڑی پینے پر مت ہنسو! جب ایک پرائیوٹ فرم میں سوا سو تنخواہ پانے والا بڈھا اکاؤنٹنٹ دس گھنٹے آنے پائیاں جوڑتے جوڑتے تھک کر دفتر سے باہر نکلتا ہے تو شفق غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ رات کے سائے پھیل رہے ہوتے ہیں۔ اُس آدمی نے برسوں سے شفق نہیں دیکھی۔ پھولوں کو کھلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کِھلتی ہوئی پنکھڑیوں پر شبنم کو برستے ہوئے نہیں دیکھا۔ برستی ہوئی انکھڑیوں سے گرتی ہوئی مسرّتوں کو نہیں دیکھا۔ پھر وہ انسان گھر کی بجائے کسی

رنڈی کے کوٹھے پر چلا جائے تو اُس کی عقل کا ماتم مت کرو۔ دُنیا کا کوئی درد کسی پر ہنسنے یا رُونے سے کم ہوا ہے؟"۔

کمٹے چُپ ہو گیا۔ یکایک اپنی شدّتِ احساس سے گھبرا کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اور دھیرے سے بولا۔

"جب ایک بے کار نوجوان، دن بھر دفتروں، فرموں، کارخانوں، دوکانوں کے چکّر لگا کے مایوس اور مجبور ہو کے اپنی گندی چال کے غلیظ کمرے میں اپنی طرح کے بے کار ساتھیوں کے ساتھ گھنٹوں شطرنج کھیلتا ہے۔ تو اُسے کاہل، سُست، بے کار اور نکمّا مت سمجھو، دیکھو کس نفرت سے وہ شہ کو مات دیتا ہے۔ ہر انسان ہر موقع پر اپنی عقل، سمجھ اور ماحول کے مطابق ایک راستہ چُن لیتا ہے۔!"

"اُس راستے پر چل کر انسان ہمیشہ بھٹکا ہے"۔ میں نے اُس سے بڑے پیار سے کہا۔ "مگر اِس وقت یہ بحث کیا بے کار نہیں ہے؟ تم یہ بتاؤ تم نے اپنے لئے کونسا راستہ اختیار کیا ہے؟"

کمٹے نے بچوّں کی طرح کے شریر اور فتح مند لہجے میں بھولے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے؟ ـــــــ میں نے اپنے چہرے کے اندر ایک اور چہرہ چھپا لیا ہے۔ دُنیا کے راستے پر چلتے چلتے کبھی ایک انسان کے دو

انسان بن جاتے ہیں۔ اور آج کل تو ہر انسان اپنی کھال کے اندر ایک سیامی جوڑا چھپائے پھرتا ہے۔ ایک انسان کے اندر ایک اور انسان۔ ایک انسان تو میرے اندر وہ انسان ہے جو اپنی مرضی کے خلاف کارٹون بناتا ہے۔ کُڑھتا ہے، جلتا ہے، جھینکتا ہے، مگر دنگرو کلی کے مالک کی مرضی پر چلنے کے لئے مجبور رہے۔ دوسرا انسان وہ ہے۔ جو مصوّر ہے۔ اور صرف اپنی مرضی سے کام کرتا ہے۔ وہ —— صرف وہ تصویر بناتا ہے۔ جس کے لیئے صرف اُس کی رُوح نے مجبور کیا ہو۔"

"کیا تم رُوح پر اعتقاد رکھتے ہو؟"

گُمٹے نے چڑ کر کہا۔" مجھے معلوم ہے۔ تمہارے ایسے لوگ رُوحوں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ مگر میں رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اِس دنیا میں صرف چلتے ہوئے جسم بھی دیکھے ہیں۔ ایسے جسم جو چل رہے تھے۔ لیکن جن کے اندر کوئی رُوح نہ تھی۔ وہ چل رہے تھے۔ اور بڑی مضبوطی سے چل رہے تھے۔ لیکن اُن کے خشونت بھرے چہروں کی سختی اور رعونت کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن میں کسی چیز کی کمی ہے۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا جیسے میں انسانوں کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ فولاد کے خالی ڈبّوں کے اندر جھانک رہا ہوں۔ مضبوط لیکن خالی۔ چمکتے ہوئے لیکن خالی۔ خوبصورت برانڈ اور رنگین لیبل سے مزیّن لیکن اندر سے

خالی۔ کیا تمہیں کبھی کسی انسان کے خالی پن کو دیکھ کر کسی وجود کی کمی کا
احساس نہیں ہوتا؟"——
"اُن صنفوں میں تو ہوتا ہے۔ جیسے شیو کے بعد داڑھی کی کمی کا احساس
ہوتا ہے!" میں نے مُسکرا کر کہا۔
"تم سے بحث کرنا بے کار ہے" گیٹے نے چڑ کر کہا۔ اور مجھ سے مُنھ پھیر لیا۔ اُس
نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی چگی داڑھی میں اُلجھا دیئے۔ اور حزیں لہجے میں بولا
"میں تو یہ نہیں کہتا کہ میرے اندر مجھ سے الگ کوئی رُوح ضرور موجود ہے۔
لیکن ایک تصویر ضرور موجود ہے۔ یا ایک تصویر کی خواہش ضرور موجود ہے۔
جس کے لئے میں ہمیشہ سے سرگرداں ہوں۔ یہ تصویر میں اب تک نہیں بنا سکا
حالانکہ میں نے اب تک سینکڑوں تصویریں بنا ڈالی ہیں۔ لیکن اِن تصویروں
میں کہیں پر مجھے وہ تصویر نہ ملی جس کی مجھے تلاش ہے۔ بس خالی ڈبے ہی ملے۔
بہت ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ اُس تصویر میں کہیں پر ایک رُوح تھی۔ جو ابھی اُٹھ
کر چلی گئی۔ وان گوگ کی "خالی کرسی" کی طرح!"
ہاں، مگر—— ایک بار—— !
مگر میں اُس کی بک بک سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ آپ عدالت میں
ہر روز پیشیاں بُھگتنے والے سرکاری وکیل استغاثہ سے اِس قسم کی توقع
نہیں رکھ سکتے۔ اِس لئے میں اُس کی باتوں سے قطعاً متاثر نہ ہو کر ایک تصویر

کی طرف دیکھنے لگا جو ایزل پر ٹنگی تھی۔ اور ابھی نامکمل تھی۔ یہ تصویر مٹی کے ایک گملے کی تھی جس میں سے گلاب کے خوش رنگ پھول جھانک رہے تھے۔ گملا جگہ جگہ سے اس طرح ٹوٹا ہوا تھا جیسے کسی نے زور سے ہتوڑا مار کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ پھر بھی گلاب کے پھول ہوا میں معلّق تھے۔ اور اُن میں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

"اس تصویر کا کیا مطلب ہے؟" ——— میں نے کمٹے سے پوچھا۔ کوئی بے ہودہ سوریلی خیال!

کمٹے اُٹھ کر یکایک اپنے ایزل کے پاس یوں کھڑا ہو گیا کہ جیسے کسی حملے سے بچاؤ کے لئے اپنی ایزل کی مدافعت اور حفاظت پر آمادہ ہو۔ آہستہ سے بولا۔

"تمہیں شان اوکاسی مشہور آئرش شاعر کے وہ مصرعے کاہے کو یاد ہوں گے!" "تم گلاب کے گل دان کو توڑ سکتے ہو۔ لیکن فضا پھر بھی پھولوں کی مہک سے رچی رہے گی!"

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ سرکاری وکیل کو ہر روز ظلم سے واسطہ رہتا ہے۔ وہ ظلم میں جیتا ہے۔ اور اُس کی کمیشن کھاتا ہے۔ میں نے اُس تصویر سے ہٹ کر اپنی نگاہیں کھڑکی کی طرف پھیر لیں جہاں ایک بڑے چوکھٹے پر ایک کالا کپڑا اڑا تھا۔ میں اُس چوکھٹے کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟ ______

"اُسے مت چھوؤ۔" یکایک گُمٹے چلاّ کر اور چھلانگ مار کر میرے اور کالے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تصویر کے بیچ میں آگیا۔

"یہ تصویر میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔"

کیوں نہیں دِکھا سکتے؟

اِس لئے کہ اِس تصویر کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہے!

میں نے ہنس کر کہا "بھئی اِس قدر نشے میں کوئی نہ ہو۔ آنکھیں تو میں رکھتا ہوں۔ اپنی آنکھوں سے میں نے تمہاری اِن دوسری تصویروں کو دیکھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے کیا میں اِس تصویر کو نہیں دیکھ سکتا۔

"ممکن ہے دیکھ لو۔ ممکن ہے نہ دیکھ سکو۔" گمٹے نے یکایک قریب کے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تصویر میری زندگی کی محرومی اور اُسکی ناکامی کی سب سے بڑی داستان ہے۔ اور کوئی بھی اپنی محرومی اور ناکامی کی انتہائی ذلّت کو کسی دوسرے پر واضح کرنا اچّھا نہیں سمجھتا۔ یہ تصویر میری زندگی کا شاہکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں اِس سے بہتر تصویر میں نے آج تک نہیں بنائی۔ لیکن جہاں جہاں بھی میں نے اِس تصویر کو نمائش کے لئے بھیجا۔ وہاں سے یہ تصویر انعام پائے بغیر واپس آگئی۔ میری دوسری تصویروں کو انعام بھی ملا۔ مگر میرے شاہکار کی آج تک کسی نے قدر نہ کی۔

تصویریں پرکھنے والے جج اس تصویر کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ چند لمحے اسے دیکھتے تھے۔ پھر سر جھکا کر آگے چلے جاتے تھے۔ کیا وہ لوگ واقعی نہ آنکھیں نہیں رکھتے؟۔ کیا وہ لوگ واقعی نہیں دیکھ سکتے۔ کہ میں نے اس تصویر میں کیا رکھ دیا ہے؟"

"کیا رکھ دیا ہے؟" میں تصویر کو دیکھے بغیر گُمٹے کے قریب صوفے میں دھنس گیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُس سے بڑی محبت سے پُوچھا۔ گمٹے کی نگاہیں اُس کالے کپڑے پر جم گئیں۔ جیسے وہ کوئی سکرین کا پردہ ہو۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"وہ بڑی ملگجی سی شام تھی۔ اور میں اپنی سکیچ بُک اور پنسل ہاتھ میں لئے کسی مزید ارکارٹون کی تلاش میں شہر کے بازاروں اور کوچوں سے چلتا، گھومتا، مُڑتا، لوگوں سے بچتا، ٹکراتا، ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا جہاں اُس سے پہلے میں کبھی نہ گیا تھا —— یہاں گلیاں اس قدر تنگ و تاریک تھیں۔ مُوریوں میں غلاظت کے اتنے انبار جمع تھے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے ایسی سڑاند آتی تھی کہ میں سوچنے لگا شاید اس علاقے کے مکینوں کی ناکیں نہ ہوتی ہونگی۔ کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ آدمی اپنے چہرے پر ایک ناک رکھے اور پھر ایسی جگہ وہ رہ سکے۔ دو تین جگہوں پر تاریکی میں ٹھوکر کھانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ان اندھیری گلیوں

میں ناک تو کیا آنکھ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آنکھ روشنی کے لیے ہوتی ہے۔ اور روشنی کے بغیر کوئی تصویر نہیں بن سکتی۔ پھر میں اِن اندھیری گلیوں میں کیوں گھوم رہا ہوں؟ ۔ میں نے گھبرا کر آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ جو تاریک بادلوں سے گھرا ہوا اِن گندی گلیوں پر ایک گدلی اور مٹیالی چھت کی طرح جُھکا ہوا تھا۔"

"بڑے جھکّی ہو دوست!" میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے کسی طرح اصل موضوع تک تو پہنچو۔"

کُتّے نے بے حد بے چین ہو کر کہا۔ "موضوع اور مُوڈ میں ایک گہرا تعلق ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں اور کیونکر سمجھاؤں۔ اور کیسے بتاؤں اُس تاریک گلی کا ماحول جس کے نُکڑ پر ایک روشن بازار شروع ہوتا تھا۔ اور جہاں پر اِس تاریکی اور اُجالے کا اِتصال تھا۔ وہاں پر بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ پوسٹ آفس کا ایک لیٹر بکس تھا۔ پانی کا ایک نل تھا۔ قریب کے ہوٹل کے کوڑے کا ایک ڈھیر تھا۔ اور اِس کے قریب چار پانچ بھکاری فُٹ پاتھ پر بیٹھے بھیک مانگ رہے تھے۔"

"احمق!" میں نے اُس سے پُوچھا، "بھلا وہ بھیک کیوں مانگ رہے تھے؟ جہاں پر پانی کا نل ہو، بجلی کی روشنی ہو، گھر پر خط ڈالنے کے لئے لیٹر بکس ہو۔ اور ہوٹل کا لذیذ کھانا ہو۔ اِنسان کو اور کیا چاہیئے؟۔ اچھے سے

اچھے فلیٹ میں ایک جگہ اتنی سہولتیں مشکل سے مل سکتی ہیں!"

کمٹے نے طنز میں کہا۔ "کیا تم ہر جگہ سرکاری وکیل بنے رہتے ہو؟۔ کبھی کسی جگہ انسان نہیں بن سکتے؟ مصیبت اور درد کا مذاق اُڑائے بغیر نہیں رہ سکتے؟ روشنی اور تاریکی کے اتصال پر کھڑے ہو کر تمہارا ضمیر کانپنے کیوں لگتا ہے۔؟ کیوں سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے۔؟ بہر حال مجھے تم سے کیا واسطہ! آج تم ایک مصور کے کمرے میں آئے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں اِس ماحول سے جُدا ہو کر اپنے روشن ماحول میں چلے جاؤ گے۔ اور تم زندگی بھر اس تصویر کو نہ دیکھ سکو گے کیونکہ اب تو میں نے اِس تصویر کو کسی نمائش میں بھیجنے کا خیال بھی ترک کر دیا ہے۔ وہ سب کے سب تصویریں پرکھنے والے تمہاری طرح سرکاری وکیل ہیں۔"

میں چُپ ہو گیا دُور گھڑیال نے تین بجائے۔ کمٹے چونک کر بولا۔ "تاریکی جا رہی ہے اُجالا آرہا ہے۔ لیکن میری تصویر کی قسمت میں نہ جانے کب تک تاریکی لکھی ہے؟ میں اِس تصویر کو نہیں بھول سکتا۔ وہ بھکاری عورت لیٹر بکس کا سہارا لئے جانے والی کتنے دنوں کی بھوکی پیاسی وہیں پڑی تھی۔ دوسرے فقیر پھر بھی اپنی کمزور آواز میں صدا لگا لیتے تھے۔ لیکن وہ بھکاری عورت سب سے الگ تھلگ لیٹر بکس سے لگی ہوئی چُپ چاپ فضا کو گھور رہی تھی۔ اُسے کس کے خدا کا انتظار

تھا؟ ـــــ مگر کیسی مایوس نظر تھی اُس کی؟ جیسے اُسکی قسمت کا لیٹر بکس اب کبھی نہ کھُلے گا۔ وہ بالکل برہنہ تھی۔ صرف رانوں پر ایک ذرا سا چیتھڑا تھا۔ ورنہ وہ بالکل برہنہ تھی۔ اور اپنے جسم کی برہنگی سے بالکل بے نیاز پڑی تھی۔ لیکن اُس کے جسم کی برہنگی پر کسی عُریانی کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے بارش کی جھڑی اور آفتاب کی تمازت اور کھُلی ہوا کے تھپیڑوں اور رنٹ پاتھ کے ننگے پتھروں کی رگڑ کھا کھا کر اُس کے کپڑوں کا ہر تار ناپید ہو چکا ہے۔ صرف ایک چیتھڑا تن ڈھانکنے کو رہ گیا ہے۔ جس کو اُس نے اپنی رانوں پر ڈال کر اپنی طرف سے ستر پوشی کر لی تھی۔ برہنہ ہوتے ہوئے بھی وہ عورت بالکل برہنہ نہ تھی کیونکہ جسم کے ہر حصّے پر میل کی اتنی تہیں جَم چُکی تھیں جیسے وہ عورت نہ ہو کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہوا ایک زنگ آلودہ لوہے کا ٹکڑا ہو! بے کار، بے مصرف بے حِس، بدصورت، بے ہنگم، بدنما، شاید یہ عورت کبھی گلاب ہوگی۔ شاید یہ بدہیئت پستان کسی معصوم بچّے کے لبوں میں دُودھ کا لبریز جام بن گئے ہوں گے۔ شاید کبھی اِن ہونٹوں کی نازک پنکھڑیوں سے کسی شاعر کو گُلاب کی مہک آئی ہوگی۔ شاید کسی صدی کے کسی موڑ پر یہ عورت بھی ایک خوب صورت گُلدان میں رکھی گئی ہوگی۔ لیکن آج وہ گُل دان ٹوٹ چکا ہے۔ وہ گُلاب مسلا جا چکا ہے۔ آج اُس گُلاب کی مہک بھی

باقی نہیں ہے۔ شاید شان اوکاسی نے جو کہا تھا وہ بالکل جھوٹ تھا۔"

"تم گلدان کو توڑ سکتے ہو۔ لیکن پھولوں کی مہک پھر بھی فضا میں رچی رہے گی۔"

"کدھر ہے شان اوکاسی! آیئے اپنے آئرلینڈ کے خوبصورت مرغزاروں سے اور اِس عورت کی زندگی کا نوحہ دیکھیے!"

"ایسا میں سوچ رہا تھا۔ اور کھڑا کھڑا یہی طے کر رہا تھا کہ میرے سامنے جو کچھ ہے وہ کارٹون ہے۔ یا تصویر ہے؟ میں نے ابھی اپنی سکیچ بُک کھولی ہی تھی کہ اتنے میں پولیس کی جیپ کی وحشتناک سائرن سُنائی دی۔ ایک کے بعد دُوسری۔ معلوم ہوا محکمۂ صفائی کے وزیر اِدھر سے گذرنے والے ہیں۔ اِس لئے سڑک پر سے ٹریفک ہٹایا جا رہا تھا۔ اور فُٹ پاتھ کے جمگھٹ کو کم کیا جا رہا تھا۔ پھیری والے اُٹھ اُٹھ کر فٹ پاتھ سے سَرکنے لگے۔ بھیک مانگنے والے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ بھکاری عورت وہیں کی وہیں پڑی رہی ــــــــ"

اتنے میں ایک جیپ لیٹر بکس کے قریب آکر رُکی۔ اُس میں سے پولیس کے دو سپاہی اُترے اور اُنھوں نے چلاّ کے اُس بھکاری عورت سے کہا۔ ہے! اُٹھو یہاں سے! وزیر صاحب کی سواری آرہی ہے۔

بھکاری عورت نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ بڑی بے بسی سے اپنے

چاروں طرف دیکھا۔ پھر اُس سے بھی زیادہ بے بسی سے اپنی برہنگی کو دیکھا۔ اُس کے بدن پر صرف ایک چھوٹا سا چیتھڑا تھا۔ جسے اُس نے اپنی رانوں پر ڈال رکھا تھا۔ اُس سے اُس کی ستر پوشی ہو گئی تھی۔ اب وہ اُٹھے تو اپنی ستر پوشی کیسے کرے؟

اُس نے بڑی بے بس نگاہوں سے پولیس کے سنتریوں کی طرف دیکھا۔ لیکن ہر شخص تو نگاہوں کی مجبوری نہیں پڑھ سکتا۔ ورنہ آج یہ دُنیا بہت مختلف ہوتی۔!

"ہے اُٹھو یہاں سے!" پولیس کے دونوں سپاہی اُسے اُٹھانے کے لئے آگے بڑھے۔

وہ بھکاری عورت یکایک گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ مادر زاد ننگی تھی۔ بالکل برہنہ، چیتھڑا اُلٹ پاتھ کے فرش پر گر گیا تھا۔ اُس نے گھبرا کر اُسے فرش سے اُٹھا لیا۔ اگلے چند لمحوں میں اُسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اُسے کہاں رکھے۔ اپنی رانوں پر یا اپنے پستانوں پر۔ یا کہیں اور۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔

یکایک اُس نے اپنے چاروں طرف اُن بے حیا اور بے شرم نگاہوں کو دیکھا جو گویا اُس کے بدن کے روئیں، روئیں میں گھسی جا رہی تھیں۔ اُس عورت نے گھبرا کر اور شرما کر یکایک اپنا چہرہ اُس گندے چیتھڑے

میں چھپا لیا۔ اور باقی سارے جسم کو برہنہ چھوڑ کر سپاہیوں کے ساتھ ساتھ آگے کو چل دی۔

"تم گلدان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر سکتے ہو۔ لیکن گلاب کی مہک پھر بھی فضا میں رَچی رہے گی"

یکایک کھُنٹے نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور سِسک سِسک کر بچّوں کی طرح رونے لگا۔

بہت دیر تک میں اُس جو کھٹے پر پڑے ہوئے کالے کپڑے کے سامنے کھڑا رہا۔ کتنی ہی صدیاں، کتنے ہی ہزاروں سال گویا گذر گئے۔ اور میں اُس کالے کپڑے کے سامنے کھڑا رہا۔ اور مجھ میں ہمّت ہی نہ تھی کہ میں اُس کالے کپڑے کو ہٹا کر اُس تصویر کو دیکھوں۔

لیکن آخر کار میں نے ہمّت کر کے ایک ہی جھٹکے میں اُس تصویر کو ننگا کر دیا۔ تصویر کو دیکھتے ہی میں چونک کر بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

اُس تصویر کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں سرکاری وکیل نہیں ہوں۔ میں مُلزم ہوں۔ اور مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں!

دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی

چونکہ بہار میں کوئی قحط نہیں ہے۔ اور کہیں پر بھکری نہیں ہے۔ اسی لیئے تو شامو بہاری ساکن موضع بتیا، ضلع مظفر پور اپنے گاؤں سے بھاگ کر زندہ اور صحیح سلامت بمبئی پہنچ گیا تھا۔ اگر بھکری ہوتی تو وہ کیوں نہ اپنے ہی گاؤں میں بھوک سے مرجاتا۔ بمبئی کیسے پہنچتا؟۔ اور صرف روٹی کپڑے پر نوکری کیسے تلاش کرتا؟ میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی باتوں کے متعلق بھانپ جایا کرتا ہوں۔ شیامو کی آمد سے میں نے یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ بہار میں کہیں پر بھکری نہیں ہے۔ گورنمنٹ بالکل سچ کہتی ہے۔ اور یہ اخبار والے بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

جب شیامو بہاری کو میں گھر لے کے آیا تو بکشمی بے حد خفا ہوئی۔ ساڑی کے پلّو میں لٹکا ہوا چابیوں کا چھلا گھماتے ہوئے بولی: "آخر تم کیا چاہتے ہو۔ میں کوئی کام نہ کروں۔ بیٹھ بیٹھ کر موٹی ہوتی جاؤں۔ اور تم بڑے آرام سے چند سالوں کے بعد کوئی دوسری نازک بانگی لے آؤ۔ نہیں جی۔ میں نہ سُنوں گی۔ میں اِس نوکر کو نکال دوں گی"

میں نے کہا "سُنو لکشمی۔ تمہیں ——— ذرا سوچو تو پیاری لکشمی تمہیں اِس گھر میں کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔"

"کیا کام کرنا پڑتا ہے؟" لکشمی بھڑک کر بولی۔ اِس گھر میں آدمی ہی کتنے ہیں۔ ایک تم ہو۔ حالانکہ مجھے اِس میں شبہ ہے۔ ایک میں ہوں۔ ایک میرا چھوٹا بھائی ہے۔ دو تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ ایک تمہارا باپ ہے۔ ایک میری بیچاری بڑھی ماں ہے۔ پانچ ہمارے بچے ہیں۔ جن میں سب سے چھوٹا ہمارا رکشو چار سال کا ہے۔ گھر کے آدمی ہی کتنے ہیں؟ کیا تم نے مجھے اپاہج سمجھ رکھا ہے؟"

"سُنو ڈارلنگ۔ آجکل کے نوکر تو بس گھر کی شوبھا ہوتے ہیں۔ کام سارا تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ گذشتہ بارہ سالوں کی طرح!

"تب ٹھیک ہے۔ مگر اسے تنخواہ کیا دینا پڑے گی؟"

"کچھ نہیں۔ بس روٹی کپڑا۔"

"بس روٹی کپڑا؟" لکشمی زور سے چلائی۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر وہ کچھ مجھے بیسویں صدی کے اِس نئے معجزے یعنی شیامو بہاری کو حیرت سے تکتی رہی جو صرف روٹی کپڑے پر کام کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ پھر میری طرف مڑ کر شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "تم تو کہتے تھے بہار میں قحط ——— !"

"بالکل نہیں۔" میں نے کہا۔ "بلکہ اِس محض روٹی کپڑے پر قناعت کرنے والے نوکر کو دیکھ کر بمبئی میں بھی قحط نہ آنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" لکشمی نے سر ہلا کر کہا۔ "چل رے شیامو اُس کمرے میں جھاڑو دے۔" جھاڑو دینے کا حکم بجا لاتے ہوئے جب شیامو نے جواب میں غسل خانے کا لوٹا پیش کیا تو لکشمی چند لمحوں کے لئے کچھ حیران سی رہ گئی۔ بعد میں جب کدو کش مانگنے پر لکشمی کو چمٹا ملا اور مجھے تولیہ مانگنے پر جوتا پیش کیا گیا۔ تو میں سمجھ گیا کہ بہار میں نہ صرف یہ کہ قحط نہیں ہے۔ بلکہ وہاں پر ایک زبان ایسی بھی بولی جاتی ہے جس کا نام میتھلی ہے۔ اور جو ہماری زبان سے بہت مختلف ہے۔ اِس سے پہلے میں میتھلی کو بھاشا کا درجہ دینے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہ تھا۔ کیونکہ ہندوستانی وِدھان میں میتھلی بھاشا کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

بہر حال آدمی اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ میں نے لکشمی سے اسکا ذکر کیا۔ چلو اچھا ہی ہوا اب تمہیں میتھلی بھاشا بھی سیکھنا پڑے گی۔ بہت عرصے سے تم نے لکھنا پڑھنا چھوڑ رکھا تھا۔

چھ ماہ کے عرصے ہی میں شیامو گھر کے کاموں میں طاق ہو گیا۔ کچھ ہم نے اُس کی بھاشا سیکھ لی۔ کچھ اُس نے ہماری غفلت سے

فائدہ اُٹھانا سیکھ لیا۔ ایک سال کے عرصے ہی میں اُس نے ہر اتوار کو چھٹی لیکر سینما جانا شروع کر دیا۔ اور دو رُوپے نقد تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگا۔ جو دوسرے سال پانچ روپے پر پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی ملازمت کے تیسرے سال میں تھا۔ اب اُس نے اپنی چُٹیا منڈا ڈالی تھی۔ انگریزی بال رکھ لیے تھے۔ اور دوسرے فیشن ایبل گھروں کے نوکروں کی طرح نیکر اور بُش شرٹ میں گھومتا تھا۔ اور میتھلی کے بجائے بمبئی کی بازاری زبان میں گفتگو کرنے لگا تھا۔ جب لوگ اپنے ملک کی بھاشا اور سنسکرتی کو بھول جاتے ہیں تو مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ رُوٹی کپڑا مانگتے مانگتے جب لوگ اپنی ملازمت کے تیسرے سال ہی میں دس روپے تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ فوراً اُٹھ کر پل اونرز ایسوسی ایشن کا ممبر بن جاؤں۔ ہم ہندوستانیوں میں اگر کوئی کمی ہے تو صرف کردار کی۔ اور جب تک فرد کا کردار اونچا نہیں ہوگا، یہ قوم کیسے اونچی ہو سکتی ہے۔ مگر میں نے شیامو کو دس روپے تنخواہ دینا بھی منظور کر لیا۔ ایک تو اِس لئے بھی کہ محلّے میں دوسرے نوکروں کی تنخواہیں اُس سے کہیں زیادہ تھیں۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ نجانے کیوں میرے دل میں غریبوں کے لئے بڑا درد ہے۔ اِس کے علاوہ شیامو گھر کے لوگوں کا مزاج خوب سمجھ چکا ہے۔ یا یُوں کہنا چاہئے کہ گھر کے سب لوگ نوکر کا مزاج

خوب سمجھ چکے ہیں۔ نیا نوکر آئے گا تو اُس کا مزاج سمجھنے میں بڑی دِقّت ہوگی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ شیامو میں ہزار نقائص پیدا ہو گئے ہوں وہ گھر کا کام بڑی دلچسپی سے کرتا ہے۔ اور ہر وقت کام میں جُٹا رہتا ہے۔ کبھی بیمار نہیں پڑتا۔ اور بمبئی کا پانی تو ایسا خراب ہے کہ یہاں آکر ہٹّے کٹّے نوکر بھی ہفتے میں دو بار بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اور مجھے صحت مند چاق چوبند لوگ بہت اچھّے لگتے ہیں۔ فرد کی صحت پر قوم کی صحت کا دارومدار ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس!

شیامو کی ملازمت کے تیسرے سال ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اُن دنوں لکشمی کو چوتھا ماہ لگ رہا تھا۔ اور وہ بیچاری آنیوالے بچّے کے لئے کپڑے اور دیگر سامان تیار کر رہی تھی۔ اُس نے بڑی محنت سے خوبصورت سے ننھّے ننھّے سے چھ فراک سیئے۔ کہ اُس میں سے دو فراک غائب ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اُن دو ننھّے ننھّے فراکوں کو چُرانے والا کون ہو سکتا ہے۔ گھر بھر میں ڈھونڈ لیا، لیکن فراک نہ ملے۔ پل بھر کے لئے شیامو پر شُبہ کیا گیا۔ لیکن پھر دوسرے لمحے ہی میں ہنس کر اس خیال کو دل سے دُور کر دیا گیا۔ اب اگر گھر کے کسی بڑے آدمی کا کپڑا ہوتا تو فوراً اسی سے

پہلے دھیان اُسی طرف جاتا۔ اُس کے بعد مُنّے کے لئے ایک پیاری سی
دُلائی جسے لکشمی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے گندا تھا اچانک
گھر سے غائب ہو گئی۔ محلّے کی بوڑھیوں نے مشورہ دیا کہ کسی جھاڑ
پھونک والے کو بُلانا چاہیئے۔ ہو نہ ہو گھر پر کسی آسیب کا سایہ
پڑ رہا ہے۔ جو آنے والے بچّے کے لئے خطرناک ہے۔ لکشمی نے
ڈر کر مجھ سے التجا کی۔ میں در اصل اِس قسم کے ڈھکوسلوں میں یقین
نہیں مگر میں کسی دوسرے کے مذہبی عقائد میں بھی دخل اندازی
نہیں کرتا۔ پھر ہندوستان میں تو ایک لادینی ریاست قائم ہو چکی
ہے۔ اِس لئے میرے لئے یعنی ایک پُرامن شہری کے لئے یہ اور بھی
لازم تھا کہ میں لکشمی کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے پنڈت گردھر پرشاد کو
گھر پر دعوت دُوں۔ اور پنڈت گردھر پرشاد سات دن ہمارے گھر آکر
جاپ کرتے رہے۔ جس سے گھر کی ساری فضا ایکدم بدل گئی۔ ماحول روشن
روشن سا معلوم ہونے لگا۔ لکشمی کی دِلی بشاشت عود کر آئی۔ اور اُس کے
بعد سے گھر میں اِس قسم کی چوریوں کا سلسلہ بھی یک لخت منقطع ہو گیا جس سے
اِس خیال کو مزید تقویت پہنچی کہ ہو نہ ہو گھر میں کوئی سایہ تھا جو
پنڈت جی کے جاپ سے ڈر کر کہیں چلا گیا ہے۔ اُس دن سے میں نے
گھر والوں کے مذہبی عقائد میں دخل دینا اور بھی کم کر دیا ہے۔ بلکہ

دودھ کا دودھ پانی کا پانی

لکشمی کے پیہم اِصرار پر دفتر میں اپنی ترقی کے لئے بھی پنڈت جی سے جاپ کرانا شروع کرادیا ہے۔ حالانکہ اپنے خیال پر اس سختی سے کاربند ہوں۔ لیکن اگر میرے ایک ذرا سے جاپ کرانے سے گھر کی لکشمی خوش رہتی ہے تو میرا کیا ہرج ہوتا ہے۔؟

تین ماہ کے بعد لکشمی نے یکایک شکایت کی۔" دودھ میں پانی مِلا ہوتا ہے۔ دو دن سے دیکھ رہی ہوں۔ دُودھ کا ذائقہ ہی بدل گیا ہے!"

میں نے کہا۔" دودھ کا نہیں، تمہاری زبان کا ذائقہ بدل گیا ہے۔ اِس حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

لکشمی بُولی۔" یہ دُودھ پی کر مجھے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔"

" اُبکائیاں بھی آتی ہیں۔" میں نے تسلّی دیکر کہا۔" کیا اتنی جلدی بھول گیئں ؟"

" میں اندھی نہیں ہوں۔" لکشمی نے جل کر کہا۔" جو اچھے اور بُرے دُودھ میں تمیز نہ کرسکوں۔ ضرور کوئی نہ کوئی اِس دُودھ میں ملاوٹ کررہا ہے۔"

" سرکاری ڈیری سے سر بہ مُہر بوتل میں بند دُودھ آتا ہے۔ یہ دُودھ نخالص کیسے ہوسکتا ہے؟"

" دُودھ ایک دم بُرا ہے۔" لکشمی نے جھلّا کے کہا۔" تم خود چکھ کے

دیکھو!"

شادی کے بعد میں تو دُودھ کا ذائقہ ہی بھول گیا۔ بچّوں ہی کے لئے پُورا نہیں ہوتا۔ مجھے کیا معلوم ہوگا۔ لیکن جب لکشمی کی بے چاری بُڈھی ماں، نے جو ہر دم گاؤتکئے سے لگی لگی حُکم چلایا کرتی تھیں اور نوّے سال کی عمر پر بھی مرنے کا نام نہ لیتی تھیں دُودھ کے متعلق شکایت کی تو مجھے غور کرنا پڑا۔ مگر غور کروں تو کیا کروں۔ گذشتہ تین سال میں شیامو نے ایکبار بھی دُودھ کی چوری نہ کی تھی۔ ایک پائی کی چیز اِدھر سے اُدھر نہ کی تھی۔ پھر اسٹیشن کے پاس جو سرکاری ڈیری کی شاخ ہے وہاں سے مُہر بند بوتل آتی تھی۔ ہر روز صبح سات بجے شیامو ڈیری کی شاخ پر جاکے کیُو لگاتا تھا، اور اپنی باری پر بوتل لیکر گھر آتا تھا۔ گھر پر آکر سب کے سامنے کھانے کی میز پر دُودھ کی بوتل رکھ دیتا تھا۔ ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ مُہر سلامت ہے۔ اب ڈیری والے دُودھ میں پانی ڈالتے ہوں تو دوسری بات ہے۔ اگر ایسا ہو تو محلّے والے ——— دوسرے گھروں کے لوگ جہاں پر بھی اِس سرکاری ڈیری سے دُودھ آتا ہے کیوں شکایت نہیں کرتے۔ اکیلی لکشمی ہی کو یہ شکایت کیوں ہے۔ ہو نہ ہو لکشمی کی زبان کا ذائقہ بدل چُکا ہے۔ اور وہ بُڈھی ماں تو سٹھیا گئی ہیں۔ یا اپنی بچّی کی ہاں

میں ہاں ملا رہی ہیں۔ اِس لئے میں نے اچھّی طرح سے سوچ ساچ کے لکشمی کو ڈانٹ دیا۔

لیکن جب میرے ڈانٹنے پر بھی لکشمی کی شکایت رفع نہ ہوئی تو میں نے شیاؔمو سے کہدیا۔

"آج سے دُودھ کی بوتل میں خود لایا کرونگا۔ تم گھر کا دُوسرا کام کرو۔"

شیاؔمو کو بُرا تو بہت معلوم ہوا۔ مگر فرمانبردار نوکر تھا۔ "اچھّا جناب" کہہ کر سر جُھکا کے کچن میں چلا گیا۔

دوسرے دن جب سات بجاتے بجاتے گھڑی نے آٹھ بجا دیے تو میں بہ ہزار دِقّت پلنگ سے اُٹھ کر شادی کرنے کی حماقت پر نفرین بھیجتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ کچن میں شیاؔمو منھ بسورے کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے ایک خالی جھولا طلب کیا۔ اُس میں دُودھ کی خالی بوتل کو ڈالا۔ دُودھ کا راشن کارڈ جیب میں رکھا۔ اور اسٹیشن پر دُودھ لینے کے لئے روانہ ہوا۔ دیر ہو چُکی تھی۔ اسلئے جب ڈیری کی شاخ پر پہنچا جہاں سے دُودھ مِلتا ہے وہیں پر نوکروں کا ایک لمبا کیو پہلے سے موجود تھا۔ میرے آگے ایک

سانولی کُھتری دُبلی پتلی نوکرانی تھی جس کے چہرے پر پرچھائیاں تھیں اور جو بڑی مشکل سے سانس لیتی تھی۔ اور جس کے پیٹ میں غالباً نو ماہ کا بچّہ ہو گا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بچّہ جَن دے گی۔ اُس کے ہونٹوں پر پیڑیاں جمی تھیں۔ اور جب اُس نے مجھے اپنے پیچھے آ کر کھڑے دیکھا تو اُس کی آنکھیں اکدم سے بجھ سی گئیں۔ اور وہ بیحد پژمردہ اور اُداس سی نظر آنے لگی۔ لیکن میں نے اُس کا کوئی خیال نہ کیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ صنفِ نازک پر مجھے دیکھ کر اِس طرح کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی پتلی سی گردن کو ذرا سا اونچا کیا اور نگاہیں اُٹھا کے دیکھنے لگا کہ ابھی کیُو کتنا باقی ہے۔

یکایک اُس لڑکی نے کہا: "آج شیامو نہیں آیا؟"

میں نے بڑی نخوت سے جواب دیا: "نہیں!"

"نہیں" میں کچھ اِس طرح کے جملے بھی شامل تھے۔ تم کون ہوتی ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والی؟ میں نوکر پیشہ لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں یہاں ہر روز دُودھ لینے نہیں آتا۔ میں اِس قسم کے ذلیل کام خود نہیں کیا کرتا۔ تمہاری یہ مجال کہ آج تم ایک نوکرانی ہو کر مجھ سے یُوں بے تکلفی سے سوال کر رہی ہو۔ صرف اِس لئے کہ

میں تمہارے پیچھے کیؤ میں کھڑا ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے؟ میں اِس کا علاج ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں آج ہی سرکاری ڈیری کے مینجر کو خط لکھتا ہوں۔ کہ وہ ڈیری کی ہر شاخ پر دو کیؤ لگوائے۔ ایک نوکروں کے لئے۔ دوسرا نوکروں کے مالکوں کے لئے۔ ورنہ لا اینڈ آرڈر کے لئے سخت خطرہ ہے! ہونہہ!"

اُس لڑکی نے بڑے ملتجیانہ انداز میں مجھ سے پُوچھا۔ "کیا وہ بیمار ہے؟"

"نہیں بالکل ٹھیک ہے۔ مگر آج سے وہ یہاں دودھ لینے نہیں آئے گا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

وہ چُپ ہوگئی۔

وہ بار بار کبھی اپنا ایک پاؤں اُٹھاتی کبھی دوسرا۔ آرام لینے کی کوشش کرتی۔ مگر کیؤ آخر کیؤ ہے۔ یہاں ہر شخص کی اپنی باری پر باری آتی ہے۔ بارے اُس کی باری بھی آگئی۔ اور اُس نے اپنے مالک کے گھر کے لئے ایک چھوٹی بوتل میں دُودھ لے لیا۔ پھر میری باری آگئی۔ اور مجھے بڑی بوتل مِل گئی۔ بوتل لیکر جب میں پلٹا تو وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اور اِس گرسنہ نگاہوں سے دُودھ کی بوتل کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ایک ہی گھونٹ میں اُسے پی جائے گی۔ اُس نے

مُنھ سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن اُس کا آگے بڑھا ہوا دستِ طلب کی طرح پیٹ گویا مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"میں خود تو کچھ نہیں چاہتی اور مجھے کچھ چاہئے بھی نہیں لیکن میرے اندر جو یہ معصوم جان ہے۔ یہ جو ظالم لوتھڑا ہے۔ جو میرا دن رات خون چُوستا ہے۔ اِس کی طلب کو میں کیا کروں۔ میں ایک غریب نوکرانی ہوں جسے خُود پیٹ بھر کر رُوٹی نصیب نہیں ہوتی۔ میں پھر اِس آنیوالی جان کے تقاضے کیسے پُورے کروں۔ یہ دُودھ مجھے دیدو۔ یہ دُودھ مجھے دیدو... بھگوان کے لیئے ——— اب صرف چند دنوں کی بات ہے۔ پھر بھگوان میرے سینے میں دُودھ اُتار دیگا۔ پھر میں تم سے کبھی اِس دُودھ کی بھیک نہ مانگوں گی۔"

میں نے دُودھ کی بوتل جھُولے میں ڈالتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ "تم شیاموں کو جانتی ہو؟"

"وہ میرا گھر والا ہے!" اُس لڑکی نے آہستہ سے کہا اور اُس کی بڑی بڑی پلکیں حیا سے اُس کے رُخساروں پر جھُک گئیں۔ میں یکبارگی چونکا پھر کچھ دیر خاموش رہ کر وہاں سے پلٹ کر اپنے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

گھر پہنچتے ہی لکشمی نے مجھے اپنے کمرے میں بُلایا۔ پُوچھنے لگی
"کیا معلوم ہوا؟"
"یہی معلوم ہوا کہ بہار میں قحط ہے۔ میتھلی ایک خوبصورت زبان ہے۔ اور ہر نوکر ایک دل رکھتا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ کوئی امیر گھر سے ایک ننھّی سی دُلائی اِس لیے چُراتا ہے کہ کسی کی بے آسرا جان کو تھوڑی سی حرارت مِل جائے۔ کوئی ہمیں دُودھ میں پانی مِلا کے اِس لئے پلاتا ہے کہ کسی کی زندگی کو تھوڑا سا آبِ حیات مِل جائے۔ لکشمی اس دُنیا میں بچّوں کی دُلائیاں اور دُودھ کی بوتلیں اِس قدر کم کیوں ہیں؟"
لکشمی کچھ نہ سمجھی حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ باہر شیامو اپنا بستر باندھ رہا تھا۔ اور نوکری چھوڑ کر جانے کے لئے بے تاب تھا۔
میں نے کہا: "شیامو کل سے دودھ تم ہی لایا کروگے۔ میں نے تحقیقات کرلی ہے۔ تمہارا لایا ہوا دُودھ بے حد میٹھا اور عمدہ ہے۔ صرف دُنیا کا ذائقہ بدل چکا ہے۔"

بلّی اور وزیر

شری اُپادھیائے کا ارادہ قطعی طور پر وزیر بننے کا نہیں تھا۔ وہ گل شاہ تار اِس ایک معمولی سے وید تھے۔ گل قند، سدھ مکر دھوج اور جوارش کمونی مروارید والی بیچتے تھے۔ مگر قصہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ چیف منسٹر کے بھانجے کو جس کا اُسی گلی میں کوبلوں کا ڈپو تھا، بچپش ہو گئی۔ اور وہ شری اُپادھیائے کے علاج سے ٹھیک ہو گیا۔ اُس نے بر سبیل تذکرہ چیف منسٹر سے شری اُپادھیائے کا اِس کا ذکر کر دیا۔ چیف منسٹر کو عرصے سے بواسیر کی بیماری تھی، اور کسی طرح ٹھیک نہ ہوتی تھی۔ چیف منسٹر نے اپنے بھانجے کے اصرار پر شری اُپادھیائے کو بُلا بھیجا۔ اور اُن کا علاج شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے چیف منسٹر جی کی پُرانی بواسیر چھ مہینوں میں ہی اُپادھیائے جی کے علاج سے ٹھیک ہو گئی۔ اب کیا تھا۔ شری اُپادھیائے چیف منسٹر کے خاندانی حکیم ہو گئے۔ اُن کا شمار چیف منسٹر کے اپنے آدمیوں میں ہونے لگا۔ شری اُپادھیائے جی کی حکمت وہ چلی کہ اُنھیں ایک، سال کے

عرصے میں ہی اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک گاڑی خریدنی پڑی۔ گھر سے بنگلے میں رہنا پڑا۔ بنگلے میں ٹیلیفون لگانا پڑا۔ بینک میں اکاؤنٹ کھولنا پڑا۔ غرضیکہ چیف منسٹر صاحب کی دوستی اُن کے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گئی۔

لیکن یہ سیاسی آدمی آپ تو جانتے ہیں، ایک دفعہ جس کے پیچھے پڑ جائیں، زندگی بھر اُسے چین نہیں لینے دیتے۔ ایک دن اُپادھیائے جی کو چیف منسٹر نے بلایا اور کہا "اُپادھیائے جی۔ آپ تو ہمارے اپنے ہی آدمی ہیں آپ جنتا منڈل کے سکریٹری کیوں نہیں ہو جاتے۔" اُپادھیائے جی نے بہت انکار کیا بولے "سرکار میں آج کل مارا الشم اور درا کشا کو ملا کر ایک نئی دوا بنانے میں مصروف ہوں۔ یوں سمجھئے گویا حکمت میں بید کا پیوند لگا رہا ہوں۔ دیکھئے اب اِس قلم سازی سے کون سی نئی چیز نکلتی ہے۔

"کون سی نکلے گی؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں!"

اِس پر چیف منسٹر نے اور حیران ہو کر پوچھا۔ مگر یہ دوا جو ابھی آپ کو معلوم نہیں کہ کیا ہو گی کس غرض کے لئے ہو گی؟

"یہ بھی معلوم نہیں!" شری اُپادھیائے جی نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

دراصل بات یہ ہے سرکار کہ انگریزی طریقۂ علاج میں پہلے بیماری ڈھونڈھی جاتی ہے، بعد میں اُس کا علاج دستیاب ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے دوا بنا لیتے ہیں بعد میں اُس کے لئے بیماری ڈھونڈتے ہیں۔"

"تو بالکل ٹھیک ہے" چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ "آپ پہلے جنتا منڈل کے سکریٹری ہو جائیے بعد میں آپ کے لئے کام ڈھونڈ لیا جائیگا۔"

چنانچہ شری اُپادھیائے جنتا منڈل کے سکریٹری چُنے گئے۔ کیونکہ وہ چیف منسٹر کے اپنے آدمی تھے۔ پھر جب اسمبلی کا الیکشن سر پر آگیا تو چیف منسٹر نے اُنہیں پھر بُلا بھیجا۔ اور کہا اُپادھیائے جی منڈل کے لوگ آپ کے کام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

اُپادھیائے جی نے حیران ہو کے کہا۔ "مگر سرکار میں تو منڈل میں ایک بار بھی نہیں بولا۔"

"یہی تو قابلِ تعریف بات ہے۔" چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ دیکھئے آج کل الیکشن سر پر آرہے ہیں۔ میرے خیال میں آپ اسمبلی کے لئے اپنے حلقے سے ممبری کی درخواست دیدیجئے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ـــــــــــ"

"مگر جناب۔" شری اُپادھیائے نے بالکل پریشان ہو کر کہا "میں اِن دنوں بہت مصروف ہوں آپ کے کامرس ڈیپارٹمنٹ کے

جائنٹ سکریٹری شری گربابرمانا تھ کا علاج کر رہا ہوں۔"

"اُنھیں کیا بیماری ہے؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پُوچھا۔

"بیماری تو انہیں وہ ہے جو میں اُن کی بیوی کو بھی نہیں بتا سکتا اب آپ خود ہی سمجھ جایئے۔"

چیف منسٹر کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی۔ رازدارانہ لہجے میں بولے" تو آپ ان کا علاج تو ٹھیک طرح سے کر رہے ہیں نا؟"

"علاج تو کر رہا ہوں۔" اُپادھیائے جی رُک رُک کر بولے۔" لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا علاج کروں؟ دراصل اس بیماری کا صحیح علاج سنکھیا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنھیں کتنا سنکھیا کھلاؤں، جس سے اُن کی بیماری تو مرجائے لیکن وہ خود نہ مریں۔ اگر سنکھیا کم دیتا ہوں تو اُن کی بیماری نہیں جاتی۔ زیادہ دیتا ہوں تو وہ خود مر جاتے ہیں۔"

"مرنا جینا تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے" چیف منسٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ مگر الیکشن تو اپنے ہاتھ میں ہے نا۔ اِس لئے آپ بس دیر نہ کیجئے۔ آپ ابھی الیکشن میں کھڑے ہو جایئے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور۔"

چنانچہ شری اُپادھیائے جی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ پھر وزارت سازی کے موقع پر جب چیف منسٹر صاحب اپنی وزارت مرتب کرنے لگے تو

اُنہیں اپنے آدمیوں کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ اُنھوں نے شری اُپادھیائے جی کو محکمۂ صحت کا وزیر بنادیا۔ اور جنگل کا محکمہ بھی اُنہیں کے سپرد کر دیا۔ کہ ہر طرح کی جڑی بوٹی کی دریافت جنگل ہی سے ہوتی ہے۔

شری اُپادھیائے جی نے وزیر بننے سے بہت انکار کیا۔ ایک تو اُن کی دھرم پتنی گیارہ بچوں کے بعد پھر سے حاملہ تھیں۔ پھر انہوں ہی وہ ایک مقامی رئیس اور کارخانے دار کی فرمائش پر سچے موتی اور جواہرات والا بہدھ مکر دھوج بنانے میں مصروف تھے۔ مگر چیف منسٹر صاحب نے اُن کی ایک نہ مانی۔ بولے "آپ یہ بھی تو سوچئے کہ اب تک جتنے وزیر میں لے چکا ہوں، کسی کی عمر ساٹھ برس سے کم نہیں ہے اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔ کسی کا سر ہلتا ہے تو کوئی دمہ میں مبتلا ہے کسی کو ذیابطیس ہے تو کوئی ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے۔ اس لئے بھی وزارت میں کسی نہ کسی حکیم یا وئید کا ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ———"

"بے شک، بے شک"، چیف منسٹر کے پرائیوٹ سکریٹری نے سر ہلا کر کہا اور شری اُپادھیائے جی وزیر بن گئے۔

شری اُپادھیائے جی وزیر تو بن گئے لیکن وہ اس وزارت بازی سے خوش نہ تھے۔ ایک تو انہیں انگریزی بھی اپنے دیس کی اصلی راشٹر

بھاشا آتی نہ تھی۔ پھر ہندی اور اُردو کو بھی وہ واجبی ہی جانتے تھے۔ اِس لئے وزارت کا سارا کام اُنھوں نے محکمے کے پرنسپل سکریٹری کو سونپ رکھا تھا۔ اور خود دوسرے وزیروں کے علاج میں لگے رہتے تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا تھا کہ اُنھیں اپنی وزارت کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی!

ایک روز سہ پہر میں جب آسمان کا رنگ عرق گاؤزبان کی طرح شفّاف تھا اور زمین ترپھلا کی طرح زردی مائل اور بھورے رنگ کی ہو رہی تھی۔ اور شری اُپادھیائے اپنی کھرل میں اصل کشتہ عنبری مرجان والا گھونٹ رہے تھے۔ چیف منسٹر کا پرائیوٹ سکریٹری اُن کے پاس آیا اور اُن کے کان میں کہنے لگا۔ "ابھی چلئے چیف منسٹر صاحب نے بُلایا ہے، بے حد ضروری کام ہے!"

"کیا اُنھیں دِل کا دَورہ پھر پڑ گیا؟" اُپادھیائے جی ایکدم متفکر ہو کر بول پڑے۔

"نہیں دورہ نہیں ہے!" پرائیوٹ سکریٹری جلدی سے بولا۔

"تو پھر میں کونسی دوا اپنے ساتھ لے چلوں۔ جلدی سے بتائیے، اُنھیں کیا بیماری ہے؟"

"کوئی بیماری نہیں ہے!" پرائیوٹ سکریٹری نے ذرا پریشان ہو کر

کہا۔ "ایک سرکاری کام ہے!"

"سرکاری کام ہے تو میرے محکمہ کے پرنسپل سکریٹری شری جتندر ناتھ کندرا کو بلا بھیجئے۔ میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں اس کھرل میں کیسی قیمتی دوا گھونٹ رہا ہوں؟"

چیف منسٹر کے پرائیوٹ سکریٹری نے بڑی خوشامد کی۔ آخر بڑی مشکل سے اُپادھیائے جی جانے کے لئے تیار ہوئے۔

جب اُپادھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی پر پہونچے تو وہاں خوشامدیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ بڑی مشکل سے چیف منسٹر صاحب نے اُن سے چھٹکارا پایا۔ اور پھر شری اُپادھیائے جی کی طرف متوجہ ہوئے۔ بولے "وزارت خطرے میں ہے!"

"کس کی؟" اُپادھیائے جی نے پوچھا۔ "میری یا آپ کی؟"

"سب کی؟ ——— اور اگر اِسوقت آپ نے میری مدد نہ کی تو میں مارا جاؤں گا۔"

اُپادھیائے جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں آپ کا اپنا آدمی ہوں کس دن کام آؤں گا۔ اُس کمبخت کا نام آپ بتا دیجئے جس نے آپ کو اِس قدر پریشان کر رکھا ہے۔ میں شہر کے دو چار غنڈوں کو جانتا ہوں ——— چاقو کے ایک ہی وار میں ———"

"نہیں نہیں اُپادھیائے جی۔ آپ بات کو سمجھے نہیں! یہ غنڈوں کے کیے سے کام نہ ہوگا۔ یہ کام تو آپ کو کرنا ہوگا۔"

اُپادھیائے جی کانپ گئے۔ بولے "یہ کام تو میں نے آج تک کبھی نہیں کیا آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ لیکن کسی کی جان لینا ——— !"

چیف منسٹر صاحب ہنس کر بولے "آپ بھی عجیب آدمی ہیں میں کہاں کسی کی جان لینے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تو ایک سرکاری کام کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

"وہ کیسا کام ہے؟"

"قومی بچت!"

"قومی بچت؟"

"ہاں قومی بچت" آج کل قومی بچت کا خیال مرکزی سرکار کے سر پر بھوت بن کر سوار ہے۔ گذشتہ ایک مہینے سے برابر چھٹیاں آرہی ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری، ٹرنک کال، ہر لمحہ مجھے دھمکی دی جارہی ہے کہ اگر میں نے قومی بچت کے کام کو سنجیدگی سے پورا نہ کیا تو میری وزارت بدل دی جائے گی۔

یہ قومی بچت کیا ہوتی ہے؟ اُپادھیائے جی نے خوفزدہ ہوکر پوچھا۔

وہ بیچارے سرکاری کاموں سے ہمیشہ کتراتے تھے۔

"مطلب یہ ہے اُپادھیائے جی کہ سرکاری کام میں بچت کرنا، سرکاری خرچ میں کمی کرنا۔ اگر دس روپے کا کام ہو تو اُسے پانچ روپے میں پورا کر لینا۔ اگر کام میں دس آدمیوں کی ضرورت ہو تو اسے دو آدمیوں سے چلا لینا۔ اس طرح کی تگڑم کو قومی بچت کہتے ہیں۔"

اُپادھیائے جی سوچ سوچ کے بولے "تو آپ وزیروں کی تنخواہیں کم کر دیجیے۔"

"وزیروں کی تنخواہ پہلے ہی کم ہو چکی ہے، اور اب کیا کم ہو گی۔" چیف منسٹر چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔

"تو آپ ایک وزیر ہی کم کر دیجیے۔ میرا استعفا حاضر ہے۔" اُپادھیائے جی فوراً خوش ہو کر بولے۔

"مگر ایک وزیر کم کرنے سے کیا ہو گا۔ اُپادھیائے جی؟"

"تو... تو... دیکھیے میرے محکمے میں پندرہ کے قریب سکریٹری صاحبان ہوں گے۔ گھٹا کے سات کر دیجیے۔"

"سات آدمیوں کی بچت سے بھلا کیا ہو گا۔" چیف منسٹر صاحب اُداس ہو کر بولے۔ "اور نیچے جائیے۔" چیف منسٹر نے مشورہ دیا۔

اُپادھیائے جی سکریٹری کی سطح سے نیچے اُتر کر سوچنے لگے۔ بولے "تو محکمہ کے سپرنٹنڈنٹ آدھے کر دیجیے۔ ساٹھ کے تیس رکھیے۔"

"تیس کی بچت سے بھی کیا ہوگا۔ اور نیچے جائیے۔ اور نیچے....."
اُپادھیائے جی اور نیچے گئے۔ کلرکوں تک پہنچے۔ تو چیف منسٹر کا دِل ذرا خوش ہوا۔ اور جب چپراسیوں پر پہنچے تو چیف منسٹر کی باچھیں کِھل گئیں۔ اُنھوں نے فوراً اُپادھیائے جی کو گلے لگا لیا۔ بولے۔ "اب آپ کچھ کچھ وزیر ہوتے جا رہے ہیں۔ دراصل ہم لوگوں —— ہم وزیر لوگوں کو بہت نیچے اُتر کر عوام کی سطح پر سوچنا چاہیے۔ آپ ایک کام کیجیے۔ میرے خیال میں آپ کا ایک دَورہ بھی ہو جائے۔!"

"دَورہ؟ مجھے تو دِل کا دَورہ نہیں پڑتا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں!"

"میرا مطلب علاقے کے دَورے سے ہے۔ آپ تین تال کا ایک چکر لگا لیجیے۔ تین تال پُرفضا پہاڑی مقام ہے اور آپ نے اب تک اپنے علاقے کا ایک دَورہ تک نہیں کیا۔ اِس سے دوسرے وزیروں کو آپ سے شکایت پیدا ہو چلی ہے۔ لہٰذا آپ تین تال کا دَورہ کر آئیے، اور وہاں بیٹھ کر قومی بچت کے سِلسلے میں اپنی تجاویز ٹھیک طرح سے سوچ لیجیے۔ اور اگر ہو سکے۔ تو وہاں مقامی اداروں کو دیکھ کر اُن میں بھی بچت کر دیجیے۔ میں آپ کو پُورا پُورا اختیار دیتا ہوں اِس سلسلے میں!"

باتیں کرتے کرتے سہ پہر سے شام ہو گئی۔ جب اُپادھیائے جی

چیف منسٹر کی کوٹھی سے نکلے تو اُنھوں نے تین تال جانے کا اور وہاں جاکر قومی بچت کرنے کا مصمّم ارادہ کرلیا تھا۔ وہ بے حد مسرور ہوکر چیف منسٹر کے بنگلے سے باہر نکلے۔ اِس وقت شام ہوچکی تھی۔ مغربی آسمان میں شفق کا رنگ شربتِ عناب کی طرح تھا۔ اور کہیں کہیں آسمان پر تارے تخم خربزہ کی طرح نکلے ہوئے تھے۔

محکمہ جنگلات کے کنسرویٹر ٹھاکر منونت سنگھ بڑے عمدہ شکاری تھے۔ پُرانے تجربہ کار حکمران تھے۔ انگریزوں کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے شری اُپادھیائے جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تین تال کے بوٹ کلب میں اُنھیں شاندار دعوت دی۔ اور اُن کا مقابلہ ہندوستان کے پُرانے ویدوں چرک اور شرنت سے کیا۔ مہارانی آف باندی پور نے اُن کے اعزاز میں ایک محفلِ رقص منعقد کی۔ اور مہاراجہ گول مال پُور اُنھیں لیک پر مچھلی کا شکار کرانے لے گئے۔ جب یہ راؤنڈ پورا ہوچکا اور شری اُپادھیائے جی نے تین تال کے جنگلات دیکھنے چاہے۔ تو ٹھاکر منونت سنگھ نے راجہ آف بانشی پُور سے کہہ کر ایک ہاتھی کا بندوبست کیا۔ اور ٹھاکر منونت سنگھ شری اُپادھیائے کو ایک ہفتے تک تین تال کی ترائی کے جنگلوں میں لئے پھرے۔ ٹھاکر منونت سنگھ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ انگریزوں کے وقت میں چیف کنسرویٹر کو جنگل کی سواری

کے لئے ایک ہاتھی ملتا تھا۔ لیکن قومی حکومت کے آنے سے ہاتھی
بجٹ میں آگیا۔ اِس کا بھی ٹھاکر منونت سنگھ کو بہت غم تھا۔ مگر
وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ دو چار بار اُنھوں نے کوشش کی، ایک مرتبہ
خود چیف منسٹر سے کہا۔ لیکن ہاتھی برابر تخفیف میں رہا۔

شری اُپادھیائے جی کو البتہ شکار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔
اِس لئے جنگل میں گھومتے گھومتے جب ٹھاکر منونت سنگھ "ہائے
وہ چیتا نکل گیا" کہہ کر ہاتھ ملتے تو شری اُپادھیائے جی زور سے
چلاّ پڑتے — "ارے وہ جھاڑی آپ نے دیکھی"؟

"کونسی؟" ٹھاکر منونت سنگھ اپنی بے دلی پر قابو پاتے ہوئے
پُوچھتے۔

"وہ جس پر چھوٹے چھوٹے سُنہرے رنگ کے پھُول لگے ہیں،"
اِس کے بعد شری اُپادھیائے جی ہاتھی رکوا کر نیچے اُترتے اور جنگل
سے بوٹی توڑ کر ٹھاکر منونت سنگھ کو دکھاتے اور کہتے: "دیکھئے عام
لوگ اسے "کٹ پکڑی" کہتے ہیں۔ مگر پراکرت میں اِسے بڑی کٹ
کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہ ربڑکرک ہے۔ یونانی میں یہ باز کلیلہ ہے!

عجیب جھمیلا ہے؟" ٹھاکر جی حیرت سے بولے۔ "کیونکہ میرے خیال
میں تو یہ آملے کا پیڑ ہے۔

جی ہاں! وہی تو ہے۔ مگر بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے فائدے؟"

اس کے بعد شری اُپادھیائے جی نے پھر ہاتھی پر چڑھ کر جو آملے کے فائدے گِنانے شروع کئے تو جی، جی، جی، کہہ کر ٹھاکر منونت سنگھ پر کچھ غنودگی طاری ہونے لگی۔ اتنے میں ٹھاکر صاحب نے جھاڑی کے نیچے ایک ریچھ دیکھا۔ اور مارے خوشی کے پھر اپنی رائفل سیدھی کی۔ کہ یکایک اُپادھیائے جی نے زور سے چلّا کر کہا "ہاتھی روکئے، ہاتھی روکئے!"

ٹھاکر منونت سنگھ نے دانت پیس کر اپنی رائفل نیچے کر لی اور بولے "نیچے تو ریچھ ہے۔"

اُپادھیائے جی ہنس کر بولے "نہیں ٹھاکر جی نیچے ایک بُوٹی ہے۔ نہایت نایاب بوٹی مجھے نظر آ گئی ہے۔ دیکھئے وہ ہاتھی کو روکئے۔ نیچے اُتر کر آپ کو دکھاتا ہوں۔"

جب تک ریچھ بھاگ گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دل ہی دل میں تو جانے کیا کچھ کہا ہو گا۔ مگر بظاہر بڑے تحمل سے ہاتھی رکوایا۔ اپادھیائے جی نیچے اُترے۔ اور ایک سُوکھی سڑی جھاڑی کے پاس جا کر رُک گئے۔ اور بولے۔ "دیکھئے یہ ہے وہ نایاب بوٹی! یہ گُھمارل بُوٹی ہے جسے پراکرت میں گُھمارل کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ڈک مارل، یونانی میں چکن فطوطہ۔ لاجواب بوٹی ہے۔ اس کی جڑ کو اگر تین سال آملے کے

رس میں بھگو کر تپِ دِق کے مریض کو کھلایا جائے تو وہ دو دن میں اچھا ہو جائے گا۔"

ٹھاکر منونت سنگھ کے دل میں خیال تو آیا کہ تین سال تک یعنی جب تک یہ بوٹی آملے کے رس میں بھیگتی رہے گی اُس وقت تک تپِ دِق کا مریض کیا کرے گا؟۔ مگر وزیروں سے اس طرح کے سوال کرنا قومی حمیت کے خلاف ہے۔ بلکہ سوال نہ کرنا ایک طرح کی قومی بچت ہی ہے!

سات دن کے دَورے کے بعد شری اُپادھیائے جی ترائی کے جنگلوں سے واپس آکر پھر تین تال میں ٹِک گئے۔ اُن کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے ہلدی، زیرہ، آملہ، بنفشہ اور اسی قسم کی سو ڈیڑھ سو نایاب بوٹیاں اِکٹھی کر لی تھیں۔ ٹھاکر منونت سنگھ کا ٹرپ بھی بُرا نہ رہا۔ وزیرِ صحت کی مداخلت بیجا کے باوجود اُنھوں نے دو چیتے شکار کر لیے تھے۔

شری اُپادھیائے جی ٹھاکر منونت سنگھ کے کام سے بے حد خوش ہو کر بولے۔ ٹھاکر جی آپ کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟

ٹھاکر جی بولے۔ حضور سب ٹھیک ہے۔ سب اچھا ہے۔ سب بہت ہی اچھا چل رہا ہے۔ بس ایک تکلیف ہے۔ اور وہ یہ کہ ترائی کے جنگل تو خود آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں۔ اِن جنگلوں میں جب

گھوڑے پر سوار ہو کر دورے کو جاتا ہوں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

"مگر مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی!" اُپادھیائے جی حیرت سے بولے۔

"آپ تو ہاتھی پر تھے نا!" ٹھاکر منونت سنگھ نے سمجھایا۔

"تو آپ بھی ہاتھی پر جایئے! کس نے آپ کو منع کیا ہے"۔؟

اُپادھیائے جی فوراً بولے۔

"کبھی کبھار اپنے رسوخ سے کسی راجہ نہاراجہ کا ہاتھی مانگ لیتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں وہ لوگ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کبھی دیتے ہیں۔ کبھی نہیں دیتے۔ ہاتھی تو دراصل سرکاری ہونا چاہیئے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اُپادھیائے جی سر ہلا کر بولے"۔ اتنے گھنے جنگلوں میں ہاتھی کے بغیر جانا سرکاری ملازم کو موت کے مُنہ میں دھکیلنا ہے۔"!

بے شک، بے شک! ٹھاکر منونت سنگھ بے حد سنجیدہ ہو کر بولے۔

"ہاتھی کتنے کا آئے گا؟" آخر اُپادھیائے جی نے سوچ کے پوچھا۔

ٹھاکر منونت سنگھ بولے۔" اچھا ہاتھی دس ہزار میں آئے گا، مگر اِن دنوں اِتفاق سے راجہ آف بانسی پور کا ایک ہاتھی پانچ ہزار میں بِل رہا ہے!"

"آپ لے لیجئے۔ میں منظوری دیتا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے کاغذات تو پہلے ہی سے تیار کر کے جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ فوراً آگے بڑھا دیے۔ خود اپنا قلم پیش کیا اور ایک لمحہ میں پانچ ہزار کا ہاتھی منظور ہو گیا۔

پھر ایسی دعوتوں، ٹی پارٹیوں کا سلسلہ چل نکلا اور کچھ اس طرح کی مصروفیت رہی کہ اگلے دس روز تک اُپادھیائے جی کو یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آئے تھے۔ یکایک رات کو دھیان آیا کہ وہ تو یہاں قومی بچت کرنے کے سلسلے میں آئے تھے۔ سوچتے ہی اُن کے ماتھے سے پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ کیونکہ آدمی سیدھے تھے اور نیک دل تھے۔ اور نہیں جانتے تھے کہ سرکاری کام کیسا مشکل کا ہوتا ہے۔ ناچار اُنھوں نے ٹیلیفون پر ٹھاکر صاحب کو بُلایا۔ اور اُن سے کہا کہ وہ اپنے مقامی محکمے کے ملازموں کی تفصیل لیکر آئیں، قومی بچت کی جائے گی۔

رات کو ٹھاکر صاحب اپنے محکمے کی تفصیل لیکر پہنچ گئے۔ شری اُپادھیائے جی نے تفصیل دیکھ کر کہا۔ آپ مجھے زبانی سمجھائیے۔

دیکھیے ایک تو میں ہوں۔ ٹھاکر منونت سنگھ بولے۔ آپ مجھے نکال سکتے ہیں۔

اُپادھیائے جی مسکرا کر بولے۔ چلیے، چلیے، ایک آدمی کو نکال کر کیا ہوگا۔ میرے آدمی میرے دو ڈپٹی کنسٹر بڑے ہیں۔ جو چھ جنگلوں کو سنبھالتے ہیں۔

باپ رے۔ پھر تو اُن کے پاس بہت کام ہو گا۔ آگے چلئے۔ میرا مطلب ہے نیچے چلئے۔

نیچے چار اسسٹنٹ ڈپٹی کنسرویٹر

اور نیچے

بارہ رینج آفیسر

اور نیچے

اٹھائیس فارسٹ آفیسر

اور نیچے

ساٹھ فارسٹ گارڈ

اور نیچے

سات ریکارڈ کلرک

اور نیچے

بلّی کا دودھ۔ نو روپے

اُپادھیائے جی یکایک رُکے۔ بولے۔ ہائیں! یہ بلّی کا دودھ کس لئے!

ٹھاکر منونت سنگھ نے بڑی سنجیدگی سے تشریح کی۔ دیکھئے حضور۔ ہمارے ریکارڈ آفس میں چوہے بہت ہیں۔ جو قریب کے جنگل سے آتے جاتے ہیں، اور ریکارڈ تلف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے سرکاری طور پر

ہم نے ایک بلی پال رکھی ہے۔ جو اِن چوہوں سے ہمارے ریکارڈ کو بچاتی رہتی ہے۔ اُس کے دُودھ پر نو روپیہ ماہانہ خرچ ہوتے ہیں۔ بس!

اُپادھیائے جی نے ایکدم غصّے سے بھڑک کر کہا۔ مگر جب سات ریکارڈ کلرک ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لئے مامور ہیں۔ تو پھر اِس بلّی کی کیا ضرورت ہے؟ نو روپئے!۔ نو روپئے!! ..... حیرت ہے ٹھاکر صاحب آپ اتنے جہاندیدہ اور تجربہ کار آفیسر ہو کر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے قوم کی گاڑھی کمائی کا قیمتی سرمایہ ایک جنگلی بلّی کو دودھ پلانے میں صَرف ہو رہا ہے!۔

ٹھاکر صاحب نے شرم سے سر جُھکا لیا۔

اُپادھیائے جی فیصلہ کُن لہجے میں بولے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ اِس بلّی کو آج ہی سے ڈسمس کر دیا جائے۔!!

"بہت بہتر"! ٹھاکر منونت سنگھ فائل کو بند کرتے ہوئے بولے۔

یکایک دروازے کے قریب سے ایک باریک سی آواز آئی۔ اور اُپادھیائے جی اپنی کُرسی سے اُچھل پڑے۔

"میاؤں!"

دروازے پر ایک بلّی کھڑی تھی۔ اور حیرت سے وزیر کو دیکھ رہی تھی!

دِل کسی کا دوست نہیں

میں اور میرا دوست کاچرو جوہو کے نائس ہوٹل میں بیئر پی رہے تھے۔ ہمارے سامنے ساحل تھا۔ ساحل کے سامنے سمندر تھا۔ سمندر کی لہروں پر جھاگ تھا۔ بیئر کے گلاسوں پر بھی جھاگ تھا۔ آسمان پر ہلکے پھلکے اُڑتے ہوئے بادل مسرت کا کف معلوم ہوتے تھے۔ ساحل کی ریت پر کھڑا ایک گوانی ہپینی گیٹار بجا رہا تھا۔ اس کے قریب ایک نوجوان مرد اور عورت باہنوں میں باہنیں ڈالے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان سپنوں کو دیکھ رہے تھے جو صرف جوانی میں کھلتے ہیں۔ مضبوط اور سانولا لڑکا بےحد وجیہہ اور پُر وقار معلوم ہوتا تھا۔ گورے رنگ کی ماڈرن لڑکی اپنے سُنہرے گیسوؤں کو جھٹکاتی ہوئی بےحد خوبصورت معلوم ہوتی تھی ——— اور ہم دونوں بُڈھے ہو چکے تھے۔ اس لئے کاچرو سے نہ رہا گیا۔ اس نے تلخ آمیز لہجے میں کہا۔

سالی ماڈرن چھوکری!

بیئر پیو۔ بیئر۔ یہی آخری سہارا ہے! میں نے نرمی سے کہا اور گلاس

اُٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیا۔

کاچرو نے ایک ہی سانس میں گلاس کو آدھا کر دیا۔ گلاس کو میز پر رکھ کر اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ کاچرو ایک جہاں دیدہ شکی تھا اور سنڈے ٹائمز کا نائب مدیر تھا۔

میں ریکس ہوٹل کے بینڈ میں کلارنٹ بجاتا تھا ہم دونوں پُرانے دوست تھے۔

اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے کیٹ یاد آتی ہے!

کیٹ! کاچرو نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

ہاں کیٹ! میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ بھی اسی کی طرح ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ میں بھی تمہاری طرح اسے ایک ساقی سمجھتا تھا!

کیا قصہ ہے؟ جلدی جلدی جبڑا چلاؤ! کاچرو نے جھلا کر کہا۔

میں یادوں میں کھو گیا۔ آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

"اِسی طرح کی خوبصورت شام تھی۔ یہی نائس ہوٹل تھا فضا میں اِسی طرح نشہ بسا ہوا تھا۔ میں زندگی سے بیزار اُکتایا ہوا اِسی طرح بیئر پی رہا تھا۔ اور آسمان پر ان رنگین شفق آمیز گلگوں بادلوں کو دیکھ رہا تھا جو خوبصورت یادوں کی طرح ذہن کے دریچے میں جھلملاتے ہیں! ——"

یہ بکواس بند کرو۔ کاچرو بولا۔ منظر نگاری ختم کرو۔ سیدھے سیدھے

بتاؤ وہ کون تھی؟

تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ میں نے حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔ اور پھر پریشان ہو کر اپنی گنجی چاند پر ہاتھ پھیرنے لگا۔!

کاچرو نے مُسکرا کے پوچھا۔ وہ بہت خوبصورت ہوگی؟

میں نے کہا۔ میں نے ساحل کی ریت میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں بیئر کا گلاس رکھ دیا تھا۔ تاکہ بیئر ٹھنڈی رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک گھونٹ میں پی لیتا تھا۔ میں نے غسل کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کتنے منٹ میں اِس گلاس کو ختم کر کے سمندر میں تیرنے کے لئے جاؤں گا کہ اتنے میں ساحل کی لہروں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اور سمندر کی لہروں سے ایک لڑکی نکلی۔

زہرہ کی طرح سمندر کے کف سے! کاچرو نے طنزاً پوچھا۔

بالکل! میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کے بھورے گیسو شانوں پر لٹیں بن کر آگئے تھے۔ اس کے بھیگے ہوئے جسم پر کہیں کہیں سمندر کا سفید جھاگ چمک رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اور وہ کسی نئے ماڈل کی گاڑی کی طرح خوبصورت چھریری اور نازک اندام تھی۔

ہاں! پانی میں دُھل کر گاڑی اور بھی چمک جاتی ہے! کاچرو بولا۔

میں نے اس حسینہ سے کہا۔ "ہلو خوبصورت جسم!"

وہ بولی۔ "ہلو گنجے!"

تیرنے سے اُس کا سینہ سُرخ ہو رہا تھا اور چھاتیاں دھڑک رہی تھیں۔ میں نے تالی بجا کر ناتس ہوٹل کے بیرے کو بلایا۔ اور اُسے ایک بیئر کا آرڈر دیا۔ پھر میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تم وینس ہو؟"

"نہیں!" وہ ہنسی۔ اور اپنے بھیگے ہوئے سُنہرے بالوں کو نچوڑنے لگی۔ "میرا نام کیٹ ہے۔ تمہارا کیا ہے؟"

"مجھے کلیان داس کہتے ہیں۔"

"کس کا کلیان کرتے ہو؟" اس نے مُسکرا کر پوچھا۔

"کلیان تو اپنا کرتا ہوں۔ داس تمہارا ہوں۔"

وہ زور سے ہنسی۔ اسکی ہنسی میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔

"سوئر!" کا جرو نے مجھے پہلی بار تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"بڑا سستا زمانہ تھا۔" میں نے اسکی بات اَن سُنی کر کے کہا۔ بیئر کا ایک گلاس چھ آنے میں ملتا تھا۔ پٹرول کا ایک گیلن گیارہ آنے میں آتا تھا۔

ہم دونوں نے اپنے معدے کی ٹنکی کو بیئر سے بھر لیا۔ اور موٹر کی ٹنکی کو

پٹرول سے۔ اور ہم دونوں بمبئی میں اُڑے اُڑے پھرے۔ بہت خوبصورت دن تھا وہ۔ ان دنوں میرے پاس رائلے کی ٹوسیٹر کار تھی۔ ٹوسیٹر ہم دونوں راستے بھر ساتھ لگ کے بیٹھے۔ اور گندے لطیفے بیان کرتے رہے۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ہنستے رہے۔ کبھی کبھی ایک کھلی بیباک ہنسی سے بے باک چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔

"میں جانتا ہوں!" اکاچرو آہستہ سے بولا۔ اسکی آنکھوں میں کسی خوبصورت یاد کی ایک چمک پیدا ہوئی۔ دوسرے لمحے میں معدوم ہو گئی۔

——"پھر تم اسے کس ہوٹل میں لے گئے؟" اس نے لہجہ بدل کے کاروباری انداز میں پوچھا۔

"وہ بعد کی بات ہے! تم سنو تو" میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ "اس سے پہلے تو وہ مقام آتا ہے۔ جب مرد عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا۔ ایسے موقعے پر ہماری ہندوستانی لڑکی کی طرح ایک شعلے کی طرح بھڑک جایا کرتی ہے۔ لیکن جب میں نے کیٹ کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اُسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ہاں مجھے کچھ محسوس ہوا۔ جیسے میرا ہاتھ کسی عورت کی کمر کے گرد نہ ہو۔ برف کی ایک سِل کے گرد ہو!"

"ٹھیک ہے اِن ماڈرن لڑکیوں میں کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔"

پھر جب میں نے اُس کے ہونٹوں کو چوما تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں

ہونٹ نہیں چُوم رہا ہوں، آئس کریم کھا رہا ہوں - اور تم جانتے ہو ہونٹ چومنے میں اور آئس کریم کھانے میں بڑا فرق ہوتا ہے -

کاچرو نے کہا- میں جانتا ہوں. جب ہونٹ بار بار غیر مردوں سے چومے جائیں تو ان میں سے عورت کا سارا رس نکل جاتا ہے، صرف آئس کریم باقی رہ جاتی ہے -

مجھے حیرت تو ضرور ہوئی، مگر کچھ اُلجھن سی بھی ہوئی. کیسی لڑکی ہے اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا. ظاہر ہے یہ بیحد اوباش اور آوارہ لڑکی ہے- اِس لئے میں اسے بلا تکلّف ایک ہوٹل میں لے گیا. کمرے کے اندر جا کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی- اور اپنی سینڈل کی ایڑیوں سے فرش کو بجانے لگی. یکایک رُک کر بولی- "اب؟"

یہ سُن کر میں اُس کی طرف باہیں پھیلا کے بڑھا-

یکایک وہ زور زور سے ہنسنے لگی-

میں رُک گیا. میری باہیں نیچے آ گریں. میرا خیال ہے میں اسوقت انتہائی احمق معلوم ہو رہا تھا-

"یقیناً" کاچرو نے لقمہ دیا-

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے ذرا غصّے سے کیٹ کی طرف دیکھ کر کہا-

وہ برابر ہنسے جا رہی تھی. ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے-

بڑی مشکل سے اُس نے اپنی ہنسی روکی۔ آخر بولی۔" اچھا تماشہ رہا۔"

" کیا مطلب ؟"

" مطلب یہ کہ تم بڑے احمق ہو۔ جب تم نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا، اس وقت بھی تم کچھ نہ سمجھے۔ جب تم نے مجھے چوما اس وقت بھی تم کچھ نہ سمجھے۔ مسٹر!"

وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دئے۔ اور میرے شانوں پر اُس کی گرفت بیحد مضبوط ہو گئی۔

اور آہستہ سے بولی۔" مسٹر۔ تمہیں یہ تک معلوم نہیں۔ کب عورت کسی سے محبت کرتی ہے۔ کب محض ایک دوست کی طرح اس کے ساتھ وقت گذارتی ہے۔ کب وہ آگ ہوتی ہے۔ کب برف بن جاتی ہے۔

" مسٹر! کبھی تم نے برف گرتے ہوئے دیکھی ہے ؟"

میں نے مجوب ہو کر کہا۔" اب دیکھ رہا ہوں !"

" تو اِس سے سبق سیکھو۔ اور ہمارے شوخ و چنچل انداز سے، ہماری لگاوٹ کی باتوں سے غلط مطلب مت نکالو۔ زندگی بہت لمبی ہے۔ اور ہم اِس دنیا میں پُرانی عورتوں کی طرح مُنھ بسورے ہوئے گذرنا نہیں چاہتے۔ اِس لئے ہماری خوش وقتی کو محبت مت سمجھو۔ کسی عورت کا جسم اتنا سستا نہیں ہوتا جتنی مرد کی نگاہ سستی ہوتی ہے !"

"مجھے معاف کردو بھئی" میں نے جھلّا کر کہا۔ اگر معلوم ہوتا کہ اس خوش وقتی کے ساتھ اتنا لمبا چوڑا لکچر بندھا ہوا ہے تو میں تمہیں کبھی یہاں نہ لاتا! یکایک میرے اُداس چہرے کو دیکھ کر اُسے ترس آگیا۔ وہ مُسکرا دی۔ اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں سے ہٹا لئے۔ اور ایکدم پُرسکون آواز میں بولی۔ جاؤ تمہیں معاف کیا۔ تم مجھے بُرے آدمی نہیں معلوم ہوتے ہو۔ اور تمہارے ساتھ آج کا وقت بہت اچّھا گزرا۔ نہیں تو آج میں رُو دیتی!"

"تو کیا تمہیں بھی؟ ——— میں نے رُک کر پُوچھا۔ کسی سے محبت ہے؟"

اور تمہارا کیا خیال ہے میں سمندر کے ساحل پر تمہیں درشن دینے آئی تھی۔ اس نے آہستہ سے محزوں لہجے میں کہا۔ آج ہم دونوں نے پروگرام بنایا تھا۔ کہ دن بھر جوہو پر تیریں گے۔ اور شام کو پکچر دیکھیں گے! ——— مگر وہ کم بخت آیا ہی نہیں!

"کون؟"

"ڈیوڈ!"

"کون ڈیوڈ؟"

"میرا ڈیوڈ!"

یکایک وہ کرسی پر اُداس ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اس نے کسی معصوم بچے

کی طرح اپنا چہرہ لٹکا لیا۔ جس کے ہاتھ سے مٹھائی چھینی جا چکی ہو۔

میں نے کہا۔ پکچر تو میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

وہ بولی۔ پکچر تو میں ضرور دیکھوں گی۔

راؤنڈ ٹو کا چہرہ طنزاً مسکرا کر بولا۔

پکچر میں میں بڑے قاعدے اور سلیقے سے بیٹھا رہا۔ کسی طرح کی پیش دستی میں نے نہیں کی۔ آخر اُس نے خود ہی مجھ پر رحم کھا کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ کہہ کر "لو اسے تم رکھ سکتے ہو" ہاتھ نرم اور گرم بھی تھا۔ لیکن جتنی دیر میں تھیٹر میں بیٹھا رہا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اپنے ہاتھ میں ایک عورت کا ہاتھ نہیں ایک ہتھوڑا لئے بیٹھا ہوں۔

پکچر کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا اینگلو انڈین باپ ایک انگریزی فرم میں سٹینو تھا۔ ماں فوج میں ویکائی تھی۔ دونوں مجھے بڑی سرد مہری سے ملے۔ کیونکہ اس وقت ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا۔ اور حالانکہ مجھے دن رات مغربی لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ اپنا پیشہ ہی ایسا ہے۔ پھر بھی میری بے تکلف خوش اخلاقی پر ان کی سرد مہری کسے اوس سی پڑ گئی۔ میں وہاں چند منٹ ہی رکا۔ کیٹ میرے ساتھ باہر پورچ تک مجھے

چھوڑنے کے لئے آئی۔ کیٹ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا ملال تھا۔ بولی۔

"یہ میرے ماں باپ پُرانے لوگ ہیں۔ یہ نہیں بدلیں گے۔"

مجھے معلوم ہے۔ اچھا گڈ بائی۔ میں اس سے ہاتھ ملا کے جانے لگا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی۔ "تم مجھے چوم سکتے ہو۔"

نہیں! میں نے غصے میں کہا۔ اور ہاتھ چھڑا کر جانے لگا۔

وہ بولی۔ ہمارے ہاں دو طرح کا چومنا ہوتا ہے۔ ایک میں دوستی ہوتی ہے اور رشتے داری۔ دوسرے میں محبت! ایک میں نہایت گہرا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ دوسرے میں صرف آداب! تم لوگ ہمارے طور طریقوں سے غلط اندازہ لگاتے ہو۔ اس لئے میں چاہتی ہوں۔ تم مجھے نہایت پاکیزگی سے چومو۔

میں نے جلدی سے اُسکے رخسار کو اپنے ہونٹوں سے چھوا اور الگ ہو گیا۔

"افوہ! اس قدر غصے سے بھرے بیٹھے ہو۔" وہ ہنس کر بولی لیکن اس نے میرے ہاتھ کو نہیں چھوڑا۔ "تم ہندوستانی بہت عمدہ رقیب ثابت ہو سکتے ہو۔"

"مجھے جانے دو اب!" میں نے کہا۔

"پھر کب ملو گے؟"

"سالی چالباز!" اب کا چہرہ غصے سے بولا۔ "کس طرح ڈور باندھ کر کھینچ لاتی ہیں یہ لڑکیاں!"

میں بھی اس وقت یہی سمجھا۔ میں نے کاچرو سے کہا۔ اسلئے میں نے دوبارہ ملنے کے لئے ہاں کہدی۔ اس نے مجھے دوسرے دن گرین میں آنے کو کہا۔ جہاں سولجر لوگوں کے لئے ایک بال ہونے والا تھا۔ اتفاق سے اس روز ریکس میں کیبرے نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ہاں کہدی۔ چلتے چلتے کیٹ نے کہا۔ ضرور آنا۔ میں تمہیں ڈیوڈ سے ملاؤں گی!

"واہ ڈھیل دیکر پھر کھینچا!" کاچرو نے مٹھی کس کے کہا۔ "یہ ماڈرن لڑکیاں بڑی حرافہ ہوتی ہیں۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں!"

جانتا تو میں بھی ہوں۔ اور میں بال میں، جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ڈیوڈ کو دیکھنے کا اشتیاق مجھے وہاں کھینچ کرلے ہی گیا۔ اس زمانے میں میں بھی جوان تھا۔ اور میری شکل و صورت بھی بُری نہ تھی۔ اس لئے میں ڈیوڈ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ آخر اس میں کون سے لعل ٹکے ہیں؟ پہلے تو میں نے جانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ پڑا پڑا اپنے کمرے میں وسکی پیتا رہا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں اپنی رائلے نکال کر گرین کے نیچے پہنچ ہی گیا۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ اور ہال زوروں پر تھا۔ ہیری کا بینڈ ایک تیز ڈانسر کی گت بجا رہا تھا۔ کیٹ اس وقت ڈیوڈ کے باہنوں میں ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے میں غصے میں گرین کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اور ہال میں جا پہونچا۔ وہاں ڈیوڈ کہیں نہیں تھا۔ اکیلی کیٹ

موجود تھی۔ اور ایک بڈھے پارسی کے ساتھ بڑی بے دلی سے ناچ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُس سے معافی مانگ کے الگ ہو گئی اور میری ٹیبل پر آ بیٹھی۔

"تم نے اتنی دیر لگا دی؟" اُس نے پوچھا۔

"ڈیوڈ نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے؟" وہ محزوں لہجے میں بولی۔ میں نے اسے ٹیلیفون کیا تھا۔ اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وہ ضرور آ جاتا۔ مگر تم جانتے ہو یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ عین موقعے پر اسکی ڈیوٹی لگ گئی ہو گی۔

"ڈیوڈ کیا فوج میں ہے؟"

"ہاں کارپورل ہے!"

"کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہے تو امریکن یہودی۔ نیویارک کا رہنے والا ہے۔ مگر مجھ سے بے حد پیار کرتا ہے۔"

"تو اس وقت تک کیوں نہیں آیا؟"

"آ جائے گا۔ جب تک تم میرے ساتھ ناچو!"

ہم لوگ صبح چار بجے تک ناچتے رہے۔ مگر ڈیوڈ نہیں آیا۔ آہستہ آہستہ ہال کی روشنیاں پھیکی پڑ گئیں۔ اندھیرا دور ہوتا گیا۔ ہال کے فرانسیسی

دریچوں سے گیٹ وے آف انڈیا کے خوبصورت نقش و نگار ہویدا ہونے لگے۔ سمندر پر پھیلا ہوا کہرا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ پھر یکایک بینڈ خاموش ہو گیا۔ کہیں دور سمندر میں چلتی ہوئی کسی موٹر بوٹ کی چگ چگ سُنائی دے رہی تھی۔

یکایک کیٹ ایک کرسی پر گر پڑی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور اس کا سینہ زور زور سے ہل رہا تھا۔

چگ! چگ! موٹر بوٹ کہیں دُور جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے یہ سب فراڈ تھا! دھوکا جو تم سے کیا گیا! کاچرو نے رائے دیتے ہوئے کہا۔ دراصل ڈیوڈ کوئی تھا ہی نہیں۔ یہ سارا قصہ نہیں جال میں پھنسانے کے لئے گھڑا گیا تھا۔

میں نے بھی یہی سمجھا۔ اور اس کے بعد جو دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ اُس میں کیٹ نے جو فاصلہ رکھا ہے مجھ سے اور جس طرح بار بار وعدہ کر کے مجھ سے ڈیوڈ کو نہیں ملایا۔ اس سے میرا یقین قوی ہوتا گیا کہ دراصل ڈیوڈ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ سب مجھے پھنسانے کیلئے اداکاری کی جا رہی ہے۔ اِس کے بعد جب کیٹ نے مجھ سے ایک روز تین سو روپے مانگے۔ تو اس دن تو مجھے یقین ہو گیا کہ کیٹ بھی ایک

سستے ٹائپ کی چھوکری ہے۔

میں نے پوچھا: "تمہیں تین سو روپے کیوں چاہئے"؟

"میں ڈیوڈ سے شادی کر رہی ہوں۔"

"تو شادی تمہارے ماں باپ کریں گے۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں تین سو روپے دینے والا۔"

"میرے ماں باپ اس شادی کے خلاف ہیں۔ کہتے ہیں ڈیوڈ ایک یہودی ہے۔"

"یہودی ہے تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم لوگ رومن کیتھولک ہیں۔ ڈیوڈ یہودی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں مانتے۔ کیونکہ ڈیوڈ مجھ سے شادی کر کے مجھے اسرائیل لیجانا چاہتا ہے۔"

"تم اسرائیل جاؤ گی؟"

"وہاں جاؤں گی۔ جہاں ڈیوڈ لیجائے گا وہاں جاؤں گی۔"

"مگر اسرائیل ایک بنجر اور ویران علاقہ ہے"۔ میں نے کہا۔

"وہاں ڈیوڈ تو ہوگا اور جہاں ڈیوڈ ہوگا۔ وہاں بہار آسکتی ہے۔ وہاں بہار کو آنا ہی ہوگا۔ ڈیوڈ کہتا ہے۔ ہم لوگ وہاں بنجر زمینوں میں کاشت کریں گے۔ اپنے ہاتھ سے ہل چلائیں گے۔ ایک نئے ملک کی تعمیر کریں گے۔ ڈیوڈ سے میرے بچے ہوں گے۔ میں انھیں عبرانی زبان

میں پُرانی انجیل پڑھاؤں گی۔ جب خدا کا حکم، شعلہ بن کر کوہ طور پر لپکا اور پہاڑوں کا جگر کاٹ گیا۔ جانتے ہو؟"

میں نے سر جھکا کر کہا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ تمہارا حکم کیا ہے۔ تمہیں تین سو روپے چاہیے نا۔ یہ لو۔ ان کا کیا کرو گی۔"

"چھبیس اگست کو ڈیوڈ کا جہاز چلا جائیگا۔ اس سے پہلے ہماری شادی ہو جانی چاہیے۔ میں اس رقم سے اپنے شادی کا جوڑا تیار کراؤنگی۔ تم میری مدد کو نہ آتے تو میں مر جاتی۔"

یکایک اُس نے مجھے چوما اور بھاگ گئی۔

چھبیس اگست کو ڈیوڈ کا جہاز جانے والا تھا۔ اور شادی کی تاریخ پچیس کو طے ہوئی تھی۔ کیٹ نے مجھے خاص طور پر بلایا تھا۔

"جرج گیٹ اسٹریٹ کے عقب میں جو پُرانا گرجا ہے۔ وہاں شادی کی رسم ادا ہوگی۔ پچیس اگست کو بھولنا نہیں۔"

"نہیں بھولوں گا!"

"ڈیوڈ کی طرف سے دو دوست آئیں گے۔ میری طرف سے صرف تم ہوگے! ضرور آجانا!"

"ضرور آؤں گا۔"

"پچیس اگست کو تم گئے ہوگے اس گرجا میں۔" کاچرو نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں"

"اور ڈیوڈ حسب دستور نہیں آیا ہوگا۔"

"ہاں! وہ تو نہیں آیا تھا۔" میں نے حیرت سے کا چرو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا!"

"پھر تم نے ــــ مسٹر جوزف کلیان داس تم نے اس لڑکی کی حالت پر رحم کھا کر اس سے شادی کی درخواست کی ہوگی۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم!"

"جو روتے روتے منظور کر لی گئی ہوگی۔"

"جو نامنظور کر دی گئی!"

"ہیں؟" یکایک کا چرو حیرت سے بولا۔ پھر اُس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کم بخت بہت چالاک نکلی۔ بھئی بہت ہوشیار نکلی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں اس کی بات کو بالکل سمجھ نہ سکا۔

"اچھا تم آگے بتاؤ۔ میں بالکل آخر میں بتاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ سپید عروسی جوڑے میں کیٹ کسی قدر حسین اور پاکیزہ معلوم ہو رہی تھی۔

اسکی آنکھوں میں ایک عجیب سا تقدس تھا۔ اور اسکی چال میں ایک عجیب طمانیت اور ٹھہراؤ۔ اب وہ برق صفت سیماب آسا لڑکی نہ تھی۔ ایک عورت

تھی۔ ایک ماں تھی۔ ایک گھر تھی۔ ایک جنّت تھی۔ ایک کائنات تھی۔ جس کی پہنائیوں میں تخلیق اور تہذیب کے گہوارے.....

"فلسفہ نہیں چاہیئے۔ کہانی سُناؤ۔" سنڈے ٹائمز کا سب ایڈیٹر کا چرو اکدم کاروباری انداز میں بول اُٹھا۔ "جب ڈیوڈ نہیں آیا۔ اور گرجے میں تم نے دیر تک انتظار کیا۔ اور جب کیٹ رو رو کر باؤلی ہو گئی۔ اور تم نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ تو پھر کیا ہو؟"

میری شادی کی درخواست پر اس نے زور سے میرے مُنہ پر طمانچہ مارا اور روتی ہوئی گرجے سے باہر نکل گئی۔ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر یہ جا۔ وہ جا.......

ارے! — کاچرو ذرا حیرت سے بولا۔ پھر تمہیں وہ کب ملی؟

اس کے بعد وہ کئی ماہ تک مجھے نہیں ملی۔ میں اسے ڈھونڈھتا رہا۔ چھبیس اگست کو میں پرنس ڈاک پر گیا تھا جس جہاز سے ڈیوڈ کو جانا تھا مگر مجھے وہ وہاں پر بھی نظر نہ آئی۔ گھر گیا تو وہاں پر بھی نہ ملی۔ اسکے باپ نے مجھے ایسی قہر بھری نظروں سے دیکھا کہ میں نے وہاں دوبارہ جانا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اس واقعے کے چند ماہ بعد وہ مجھے رکس ہوٹل کے کیبرے میں مل گئی۔ اچانک۔ ایک دم۔ وہی شوخ چنچل اداؤں والی کیٹ۔ جیسے اُسے کوئی پُرانی بات یاد نہیں رہی تھی۔ بہت جلد ہی

ہم دونوں گھل مل گئے۔ اور اب وہ میری بیوی ہے۔!

کاچرو کچھ کہنے والا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ جلدی میں وہ گلاس اُٹھا کر خالی کر گیا۔ اور مُسکرا کر بولا۔

"دوست کچھ بھی کہو۔ تمہاری بیوی تم سے شدید محبّت کرتی ہے۔ مگر اس نے یہ ایک انوکھا ڈھنگ تم سے شادی کرنے کا رچایا تھا میں اسکے تریا چرتر کی داد دیتا ہوں"!

میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ اگر کبھی میں چڑانے کی خاطر کیٹ سے ڈیوڈ کا ذکر کرتا۔ تو وہ ہنس کر کہتی وہ تو اک ادا تھی تمہیں پھنسانے کے لئے۔ اور تم اس میں پھنس گئے۔ ورنہ ڈیوڈ کا وجود ہے کہاں؟

لیکن کبھی کبھی مجھے شبہ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر۔ جب میرا بڑا لڑکا پیدا ہوا۔ تو اس نے اس کا نام ڈیوڈ رکھا! کیوں؟

"تمہیں چڑانے کے لئے"۔ کاچرو نے جواب دیا۔

"کبھی کبھی رات میں سوتے سوتے بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ ڈیوڈ! ـــــ میرے ڈیوڈ!!"

"تمہیں جلانے کیلئے! یہ سب تریا چرتر ہے۔ میں جانتا ہوں!"

میں نے کہا "کبھی میں بس یہی سمجھتا تھا۔ مگر آج یہ خط آیا ہے۔ میری بیوی اس وقت غسل خانے میں تھی۔ میں نے ڈاکئے سے لے لیا۔

لیکن جب میں نے اس پر اسرائیل کا ٹکٹ دیکھا۔ تو میں چونک گیا۔
میں نے جلدی سے اس خط کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔
کاچرو میری طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔
میں نے جیب سے خط نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔
کاچرو دیر تک اس خط کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اسے پڑھے بغیر
میری طرف سرکا دیا۔ اور بولا۔ اس میں کیا لکھا ہے؟
میں نے کہا۔ اس میں ڈیوڈ کی تصویر ہے؟ ڈیوڈ کا خط ہے؟ پانسو پونڈ
کا ایکسچنج ڈرافٹ ہے۔ ڈیوڈ اسے اسرائیل بلا رہا ہے۔!
کاچرو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔
میں نے کہا غلطی میری تھی۔ میں نے کیٹ کے جذبۂ ترحم کو عشق سمجھا۔
حالانکہ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کے لئے اس کا عاشق کبھی نہ تھا۔ میں
تو ایک رومال تھا۔ جس سے وہ کبھی کبھی اپنے آنسو پونچھ لیا کرتی تھی۔ ایک
بٹوہ تھا جس سے کبھی کبھی وہ پیسے نکال لیا کرتی تھی۔ ایک اندھیرا کونہ
تھا جہاں وہ کبھی کبھی اپنی زندگی کے راز لوگوں کی نظروں سے
چھپا کر رکھ دیا کرتی تھی! مجھے اُس سے محبت تھی۔ اُسے تو نہ تھی!"
اب تم کیا کرو گے؟ کاچرو کی نظریں اپنے گلاس پر جم گئیں۔
میں نے اپنے سینے سے اُبھرتی ہوئی آہ کو بڑی مشکل سے دبا کر

کا چرو سے کہا۔

"میں اسے اس کا خط دیدوں گا۔ اور بنجر زمینوں میں بہار آجائیگی۔ اور جو جس کا ہے وہ اس کا ہوجائے گا۔ اور خوابوں میں ماں نے جس کے بچوں کا مُنہ چوما تھا۔ وہی بچے سپنوں کے جزیروں سے سر کتے ہوئے اس کے پاس آجائیں گے۔ اور زیتون کی چھدری چھاؤں میں یا جھکے ہوئے انجیروں کے خنک سایوں میں پُرانی عبرانی زبان میں قدیم انجیل پڑھیں گے۔ جب خدا کا حکم شعلہ بن کر کوہ طور پر لپکا اور پہاڑوں کا جگر کاٹ گیا.....

میں نے خط اُٹھا کر لرزتی ہوئی اُنگلیوں سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور باہر ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ تاکہ کاچرو میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔

ساحل پر سُنہرے بالوں والی لڑکی نے اپنا سر اپنے محبوب کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ اور اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔

خوابوں کے جزیرے!

چینی پنکھا

چینی پنکھا

میں نے شادی نہیں کی۔ زندگی میں مجھے عورت سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ صرف ایک بار ایک لڑکی مجھے ذرا سی پسند آئی تھی۔

میں نے اُسے پہلی بار پطراش رستوران میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں پر ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ پطراش رستوران بمبئی میں پہلا رستوران تھا جس نے بیرہ گیری کے کام کے لئے عورتیں ملازم رکھی تھیں۔ ہلکے گلابی فراک میں ملبوس سُبک اندام لڑکیاں پھولوں کی طرح مہکتی ہوئیں ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل تک چلی جاتی تھیں۔ اُن کی خوب صورت مُسکراہٹیں، رنگین ناخن، اور جگمگاتے ہوئے چہرے رستوران کو ہر روز مقبول تر بناتے جا رہے تھے۔ میں بھی وہیں پہنچا، جہاں ہر بوالہوس پہنچتا ہے۔ وہاں پر میں نے پہلی بار سریتا کو دیکھا۔

اُس کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس نے اُنھیں پیچھے سے کس کر اُن کی پونی ٹیل بنا ڈالی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں تھا۔ لپ اسٹک نہ ہوتا کوئی بات نہیں تھی۔ مگر مُسکراہٹ بھی تو

نہیں تھی۔ رنگ ایسا کھلتا ہوا تھا گویا کسی نے نربدا کی سنگ مرمر کی پہاڑیوں سے تراشا ہو۔ اس کا گلابی فراک اُس کے جسم پر بالکل پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے لوگ اُس کا رنگ دیکھنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ اُس کی چال دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ اُس کی چال میں شاعرانہ تمکنت کے ساتھ ایسی مکمل آوارگی تھی کہ اُسے دیکھ کر بیک وقت کلوپیٹرا اور مارلن منرو کا خیال آتا تھا۔ جب وہ آرڈر لیکر چلتی تھی تو مرد اِس حسرت سے اُس کی پُشت کو دیکھتے تھے کہ جیسے وہ کسی عورت کو نہ دیکھ رہے ہوں، تاج محل کو دیکھ رہے ہوں۔

جب وہ اپنے مخصوص نک چڑھے انداز میں میرا آرڈر لے چکی۔ تو میں نے اُس سے کہا۔

"تم مُسکراؤ گی نہیں؟"

"کیا یہ بھی آرڈر میں شامل ہے؟" اُسکی اُچٹتی ہوئی نگاہ میرے سر کے اوپر کہیں چلی گئی۔

"آرڈر میں تو نہیں آداب میں شامل ہے!"

اُس کے ہونٹ اپنی جگہ پر ذرا سے ہلے۔ ایسے غصیلے خمیدہ، پتلے ہونٹ تھے وہ پاگل بنا دینے والے۔ اِن ہونٹوں کی ہنسی کیسی جان لیوا ہوگی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ اور اُس سے کہا: "اس وقت تمہارے ہونٹ

ہملیٹ کی طرح سوچ رہے ہیں۔ مُسکراؤں کہ نہ مُسکراؤں؟"

"افسوس ہے کہ آپ ہملیٹ نہیں ہیں!" اُس نے بڑی نخوت سے کہا

"تم کون سی اُوفی لیا ہو؟" میں نے فوراً گستاخی سے جواب دیا۔

اُس کی اُچٹتی ہوئی نگاہ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں واپس آئی۔ وہاں پر اُس نے کچھ ڈھونڈا۔ دوسرے لمحے میں وہ پُشت پھیر کر واپس چلی گئی۔ معلوم نہیں اُسے میری آنکھوں میں کچھ مِلا کہ نہیں مِلا۔ مجھے اُسکے مستانہ خرام میں بہت کچھ مِل گیا۔

آپ کو چونکنا نہیں چاہئے۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔ میں نے آج تک شادی نہیں کی۔ کبھی کسی عورت سے محبت نہیں کی۔ اِسی لئے اچھے اخلاق پر میں آپ کا لیکچر سُننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جب وہ بھری اِن دن آئس کریم کی پلیٹ میرے سامنے رکھ چکی تو بولی: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس رستوران میں بالعموم جتنے مرد آتے ہیں وہ آئس کریم کھاتے ہیں۔ اور جتنی عورتیں آتی ہیں وہ کافی آرڈر کرتی ہیں؟"

میں نے کہا: "اِس لئے کہ مرد کافی ہوتے ہیں اور عورتیں آئس کریم!"

وہ برجستہ بولی: "میرے خیال میں مرد ناکافی ہوتے ہیں!"

میں بھنّا کر اُسے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ مگر وہ مُسکرا کر پلٹ گئی۔ بڑی ہی

تلخ اور زہریلی مسکراہٹ تھی وہ۔ یہی مسکراہٹ تو میں دیکھنا چاہتا تھا —— اِن لبوں کا زہر بھی اگر پینے کو مِل جائے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اپنے دِل میں سوچا۔ پھر اِس خیال کو اپنے دِل سے مِٹا دیا۔ ہونہہ! کیا بے ہودہ خیال ہے۔ عورت سے آئس کریم بہتر ہے۔ کیونکہ آئس کریم تو ختم ہو سکتی ہے۔ لیکن عورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یقین نہ ہو تو ایک دفعہ آرڈر کر کے دیکھ لو۔!

میں نے اپنی کھوپڑی کو بڑی شفقت سے تھپتھپایا۔ شاباش تم بڑے عقل مند دماغ ہو۔ بہت عمدہ بھیجہ رکھتے ہو۔ تمہارے ہوتے ہوئے کوئی عورت مجھ پر قبضہ نہیں کر سکتی!

میں آئس کریم کھا کر بطرِیق رستوران سے چلا گیا۔ اور دوبارہ کبھی وہاں نہیں گیا۔

کوئی چار ماہ کے بعد میری ملاقات پھر سریتا سے ہو گئی۔ گف بریڈ ہونٹ کے قریب سمندر کے کنارے ایک بہت بڑا کشتی نما رستوران کھلا تھا جس میں نوجوان لڑکیاں جہازیوں کا سا لباس پہنے ہوئے بیرہ گیری کرتی تھیں۔

"ہائی سلیر!" میں نے سریتا کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"بیرکا ایک گلاس لاؤ!" آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے کیونکہ سب کو

معلوم تھا کہ یہ روبھبش ہے۔ مگر میں تو سرِیتا کی ہنسی دیکھنا چاہتا تھا ورنہ معلوم تو مجھے بھی تھا۔

مگر سرِیتا میرا جملہ سُن کر بھی بالکل نہیں ہنسی۔ وہ میرے ٹیبل پر بھی نہیں رُکی۔ بلکہ دوسری ٹیبل سے آرڈر لینے چلی گئی۔ اور میرے ٹیبل پر کوئی دوسری ہی لڑکی آ گئی۔ بڑی دلنواز لڑکی تھی یہ۔ بے حد ترنم اور دلربا۔ چال بھی اچھی۔ ادا بھی اچھی۔ مُسکراہٹ بھی اچھی۔ ہر پہلو سے سینما کے اشتہار کی طرح مکمل۔ ایر ہوسٹس کی طرح ممتا سے لبریز۔ وہ اپنے ہاتھ میں پلاسٹک کی جلد میں ملفوف مینو لئے میرے ٹیبل پر جھک گئی۔

میں نے اُس سے کہا۔ "میں آرڈر دے چکا ہوں!"

"کسے؟"

"وہی تو تمہارے ہوٹل میں سب سے بد دماغ لڑکی ہے اُسے آرڈر دے چکا ہوں۔"

اُس نے ایک لمحے کے لئے سرِیتا کی پُشت کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف اُس نے بڑی ادا سے ایک جگمگاتی ہوئی روشن مُسکراہٹ اِس طرح پھینکی جیسے دیوالی کی رات میں بچے ایک دوسرے پر پھلجھڑی پھینکتے ہیں۔ وہ مُسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ اخاہ! میں سب جانتی ہوں۔

ہر عورت یہی سمجھتی ہے کہ وہ مردوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مگر یہ ہمیں جانتے ہیں کہ وہ کیا جانتی ہے۔ بھلا مچھلی سمندر کے بارے میں کیا جان سکتی ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد سریتا میری ٹیبل پر آئی۔ بولی "ڈالی بولتی ہے تم نے مجھے آرڈر دے دیا ہے۔ مگر میں نے تمہارا آرڈر نہیں لیا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اب عرض کرتا ہوں۔"

"فرمایئے۔" وہ پیشہ ور ویٹرس کی طرح مودب انداز میں میری میز پر جھکی۔ اُس کی شفاف جبیں پر سَو بل تھے!

میں نے کہا۔ "مجھے ایک فرائی مُسکراہٹ چاہیئے۔ غصّے میں تلی ہوئی!"

وہ چونکی۔ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اُس کی شفاف جبیں کے ٹیڑھے تیور بھی غائب ہو گئے۔ اب اُس کے ہونٹوں پر وہی زہر خند ہنسی آئی۔ جو مجھے اِسقدر پسند تھی۔ میں نے اُس سے پُوچھا۔

"اِس رستوران کے گاہکوں کو تمہاری کون سی ادا پسند ہے؟"

"وہی میری آوارہ چال! کیسی گندی نظروں سے میری پُشت کو دیکھتے ہیں۔" سریتا خفا ہو کے بولی۔ حالانکہ نطشے عورت کے بے ہنگم دھڑ کے بارے میں اتنا کچھ کہہ گیا ہے۔

میں نے پُوچھا۔ "تم نطشے اور شیکسپیر پڑھ کر بھی اِس رستوران میں

نوکری کرتی ہو۔ کیوں؟"

جواب میں وہ بولی "کہیے تو آپ کا بھیجہ فرائی کرلاؤں۔ بہت ٹوہ لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔ میرا خیال ہے میں تم میں دلچسپی لے سکتا ہوں۔ تم مجھے ایسی عورت معلوم دیتی ہو جس سے آدمی بور ہوئے بغیر دس منٹ بات کرسکتا ہے۔ کرسی کھسکالو اور میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے آئین سٹائن کا فلسفہ اوقات پر بحث کرونگا۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ اگر ہم زمین سے مریخ تک روشنی کی رفتار سے اُڑیں تو وقت آدھا رہ جائے گا۔ اور ہمارے دل کی دھڑکن بھی آدھی ہو جائے گی اور ———"

"اور اگر میں آپ سے اِسی طرح باتیں کرتی رہی تو منیجر کے دل کی دھڑکن بالکل ہی ختم ہو جائے گی" وہ طنزاً بولی "اب آپ مجھے ایک لمبا سا آرڈر دے دیجئے ———" وہ پنسل کی نوک پیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

شام کے آٹھ بجے کے قریب میں اپنی گاڑی لیکر کف پریڈ پوائنٹ پر پہنچ گیا۔ مجھ سے پہلے چار گاڑیاں اور کھڑی تھیں۔ اور اُس کا انتظار

کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ثریا کشتی نما ہوٹل سے باہر نکلی۔ اب ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی۔ اُس نے اُودے رنگ کی گنجی ورم کی ایک عمدہ ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں بانس کی کھپچیوں کا بنا ہوا شانتی نکیتن کا منتھس بیگ۔ پاؤں میں سُورت کے سُنہری سینڈل۔ پونی ٹیل غائب تھی۔ سیدھی مانگ اور چمپا کی وینی سے مہکتا ہوا جُوڑا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا جگمگاتا ہوا رنگ اور ایک میٹھی، مہربان، معصوم مُسکراہٹ!

اُس نے باہر نکل کے چند لمحوں کے لئے اپنا ہینڈ بیگ جُھلایا۔ پانچوں گاڑیوں کو دیکھا۔ آخر وہ شرماتے لجاتے ساڑی پلو ٹھیک کرتے ہوئے میری گاڑی کے پاس آئی اور سمٹ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اور مسکین لہجے میں بولی "چلئے!"

کیسا نرم اور ملائم لہجہ تھا۔ بالکل پلاسٹک کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کیسی ثریا ہے؟ میں سوچنے لگا۔

ثریا نے شرما کر آہستہ سے میرے کوٹ کے کالر کو چُھوا۔ اور دھیرے سے بولی۔ "اب چلئے بھی۔ مجھے اِن مردوُوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ دیکھئے کس طرح یہ چاروں گاڑیوں والے مجھے گھور رہے ہیں۔ جلدی چلئے۔ پران ناتھ!"

"پران ناتھ" پر میری ہنسی نکل گئی۔ کم بخت بہت عمدہ ایکٹنگ

کرتی ہے۔ ہم دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کے لئے کہا۔

گاڑی شہر سے باہر سڑک پر جا رہی تھی۔ اور گو سمندر کے کنارے کنارے جا رہی تھی لیکن پھر بھی اکتوبر کی حبس سے جان جھلستی جا رہی تھی۔ بمبئی میں اکتوبر کے مہینے میں جیل خانے کی سی گرمی ہوتی ہے۔

"ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" سریتا نے لاپروائی سے پوچھا۔ اور کچھ اس انداز سے پوچھا گویا کہہ رہی ہو کہ اگر ہم جہنم میں بھی چلے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

میں نے کہا۔ "وہار لیک پر چلو گی؟"

وہ دفعتاً چونکی: "وہار جھیل پر کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کسی جگہ پر بھی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "اور ہر جگہ سب کچھ ہے؟"

"کسی جگہ پر بھی کچھ نہیں ہے!" اس نے بڑی آزردگی سے کہا۔ اور عقب کے گدوں کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا: "وہاں پر ایک جھیل ہے۔ جھیل میں پانی ہے۔ پانی میں کشتی ہے۔ کشتی میں دو دل ہیں۔"

"دو دلوں میں راکھ ہے۔ راکھ میں چنگاری ہے!" وہ میری بات

مکمل کرتے ہوئے بولی "چنگاری میں آگ ہے۔ آگ دِل کو جلاتی ہے!"
میں نے کہا "اور جھیل کے قریب ایک ڈاک بنگلہ ہے۔ اور کل اتوار ہے۔"
وہ بولی "میں آج تک کسی ڈاک بنگلے میں نہیں رہی۔ ڈاک بنگلہ؟ ڈاک بنگلہ؟ چھی! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پوسٹ آفس کا چھوٹا بھائی ہو!"
میں نے فوراً جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں۔ قریب کی پہاڑی پر میرے ایک دوست آنند کا بنگلہ ہے۔"
وہ پھر چونکی ــــ گویا اپنے دِل سے پوچھ رہی ہو۔ اب کیا بہانہ کروں۔ بولی۔ "کون آنند؟"
میں نے کہا "دھرم پال آنند۔ تم اُسے نہیں جانتی ہو۔ اُس نے ایک مشہور فلم ایکٹرس سے شادی کر رکھی ہے۔ جس کے پاس بلیک کا ساٹھ لاکھ روپیہ ہے۔ اور عمر صرف پچاس برس ہے لیکن دھرم پال آنند اپنی بیوی سے بے حد پیار کرتا ہے۔ تم دھرم پال آنند کو دیکھو گی تو حیرت میں رہ جاؤ گی۔ بالکل کھانڈ کا بنا ہوا خوبصورت لڑکا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی انسان کہہ اُٹھتا ہے۔ کیا کوئی مَرد بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے؟"

"واقعی؟" وہ خوابوں میں کھو گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے اُسے بہت دیر تک خاموش دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں!" وہ چونک کر بولی۔ اور یکایک اُسکی بشاشت عود کر آئی۔ وہ میری طرف چُبھتی ہوئی شریر نگاہوں سے دیکھ کر بولی "اچھا بتاؤ تم کام کیا کرتے ہو۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جیون ہے۔ میں —— پہلے —— ایک اخبار میں رپورٹر تھا اور بھوکا مرتا تھا۔ اب میرے پاس ایک گاڑی ہے اور میں سونے کی سمگلنگ کرتا ہوں۔"

سرتینا بولی "یوں کہو۔ اب میں سونے کی سمگلنگ کرتا ہوں، اور میرے پاس ایک گاڑی ہے!"

میں غصّے میں بولا "مگر میرا دھندا بالکل صاف اور ایمانداری کا دھندا ہے۔ میں باہر سے جو سونا منگاتا ہوں وہ مجھے یہاں ساٹھ روپے تولہ پڑتا ہے۔ نوّے روپے میں اُسے آگے بیچ دیتا ہوں۔ سیدھا صاف دھندا ہے۔ نہ کوئی کھٹ پٹ نہ پرمٹ۔ نہ کسی کو رشوت دُوں۔ نہ کسی کے گھر ڈالی لے جاؤں۔ اپنا کام خود کرتا ہوں۔ جب جیل جاتا ہوں خود جیل جاتا ہوں۔ کسی دوسرے کو جیل نہیں پہنچاتا۔"

"کتنی بار جیل جا چکے ہو؟"

"دوبارا!"

"ویری گڈ۔ بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے پوچھا: "وہ چار گاڑیوں والے کون تھے؟"

سریتا نے کہا: "مت پوچھو۔ زندگی بڑی پیچیدہ ہے!"

میں چپ رہا۔ مجھے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے چاروں کو زک دی تھی۔ سریتا میری گاڑی میں ہے۔ میں کسی کی کیا پرواہ کرتا ہوں۔ اب میں سریتا کی بھی کیا پرواہ کرتا ہوں۔ کم بخت کس آسانی سے میری گاڑی میں چلی آئی۔ اتنی آسان فتح مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ دو چار دن اس نے مجھے جلایا ہوتا۔ چکر دلوائے ہوتے۔ ہزار دو ہزار خرچ کروا دیئے ہوتے تو مزہ بھی آتا۔ کیسی احمق لڑکی ہے۔ دوسری ملاقات ہی میں گاڑی میں بیٹھ کر چلی آئی۔ یہ بیچاری بھی آخر عورت نکلی۔ مجھے سریتا پر رحم آنے لگا۔ میں نے اپنا بازو اس کی پشت کی طرف بڑھایا۔ سریتا بولی۔ آگے کو ہو کر جھک کے بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنا بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک دستی پنکھا نکالا۔ اور اسے کھول کر جھلنے لگی۔

"اُفوہ! بڑی گرمی ہے!" وہ پنکھا جھلتے جھلتے بولی۔

یہ ایک مہک خوشنما دستی چینی پنکھا تھا۔ صندل کی لکڑی کا بنا ہوا سمٹ کر دو انگلیوں میں آجاتا تھا۔ اور پھیل کر پورے چہرے کو

ڈھک لیتا تھا۔ یکایک ثریا نے ایک ادا سے اِس چینی پنکھے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور اُس کی شریر نگاہیں میرے دل و جگر کو برمانے لگیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ ثریا نے فوراً وہ پنکھا کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ بولی۔

"دیکھو! اِس پر کیا لکھا ہے؟"

میں نے چینی پنکھا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے سونگھا۔ صندل کی ہلکی ہلکی مہک اُس کے ریشے ریشے سے آتی تھی۔ آخری دو دستوں پر دو تصویریں کھدی تھیں۔ ایک طرف ایک پہاڑی کے پیچھے ایک چینی مرد کھڑا تھا۔ دوسری طرف ایک عورت ٹمٹماتے ستارے کے نیچے کھڑی تھی۔ بیچ کے نازک منقش دستوں پر چینی زبان میں ایک عبارت کندہ تھی!

"کیا تم پڑھ سکتے ہو اِسے؟" ثریا نے مجھ سے پوچھا، "اِس پنکھے پر یہ کیا عبارت لکھی ہے؟"

میں نے کہا، "جانِ من! میں اِسے پڑھ تو نہیں سکتا لیکن سونگھ سکتا ہوں۔" میں نے چینی پنکھے کو زور سے سونگھتے ہوئے کہا۔ "ہائے! مجھے تو یہ محبت کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

ثریا بولی۔ "جب تک وہار لیک پر تمہارے دھرم پال آنند کے گھر

پہنچتے ہیں۔ آؤ اس محبت کی کہانی کو پڑھ جائیں۔ میں عورت بنتی ہوں،
تم مرد بن جاؤ۔"

"بن جاؤ کا کیا مطلب؟ میں تو مرد ہوں۔ جیسی تم عورت ہو۔"
سریتا نے لکڑی کے خوشنما ستوں پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا۔
"یہ عبارت دائیں سے بائیں چلتی ہے۔ یا بائیں سے دائیں؟"
"اوپر سے نیچے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "یہ محبت کی کہانی ہے نا!
سریتا ہنسی۔ ہنسکر اس نے اپنی انگلی عورت کی تصویر کے نیچے لکھی
ہوئی عبارت پر رکھی، اور اُسے نیچے گھماتے ہوئے بولی۔

میں می ماؤ۔
فاؤ چانگ علاقے کی عورت۔
تنگ کے پیڑ کے نیچے۔
جھیل کے کنارے تیرا انتظار کرتی ہوں۔
میں نے مرد کی تصویر کے نیچے انگلی گھماتے ہوئے کہا۔
میں کوانتنگ کے پہاڑوں کا مرد۔
اپنی یخ بستہ چوٹیوں سے اتر کر۔
چیل کے جنگلوں سے گزرتا ہوا۔
رواں دواں ندیوں سے کھیلتا ہوا۔

جھیل کے اُس کنارے پہنچتا ہوں۔
جہاں تو کھڑی ہے!
تم کیوں آئے ہو مرد؟
تم یہاں کیوں کھڑی ہو عورت؟
میں جھیل میں اپنی تیرتی ہوئی بطخوں کا رقص دیکھتی ہوں۔
اور میں جھیل میں تیرتے ہوئے تیرے چہرے کا عکس دیکھتا ہوں!
سرینا بولی۔ فاؤچانگ میں اخروٹ شہد کی طرح میٹھے ہیں۔
اور چاول کے دانے عورت کی انگلیوں کی پوروں کی طرح نازک اور حسین ہیں۔
فاؤچانگ کی جھیل کے جتنے نغمے ہیں
وہ موسم بہار میں تنگ کے درختوں پر سرخ پھول بن کر کھل جاتے ہیں۔
فاؤچانگ کے علاقے کی عورت اپنے گھر میں مطمئن ہے۔
اجنبی اِس جھیل کا عکس نہ دیکھ۔
میں نے کہا۔ میرے کو انتگ کے پہاڑ پر سدا برف رہتی ہے۔
طوفان کے جھکڑ چلتے ہیں۔
وہاں سرد چٹانیں ہیں۔ اور ننگے نوکیلے پتھر۔
میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔
نہ اخروٹ، نہ چاول، نہ جھیل، نہ نغمے،

پھر بھی می چاؤ میں تیرا عکس دیکھتا ہوں۔

کیونکہ مجھے تجھ سے محبت ہے!

سرِیتا نے کہا۔

اے اجنبی۔

میں تیرے لئے کوانتگ کے برفیلے پہاڑ پر جاؤں گی۔

اور طوفانی جھکڑوں کا سامنا کروں گی۔

سرد چٹانوں پر رہوں گی۔

اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلوں گی۔

اور تُتنگ کے سُرخ پھولوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کروں گی۔

کیونکہ میں عورت ہوں!

یکایک سرِیتا نے دستی پنکھا بند کرکے اپنی گود میں گرا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کے رونے لگی!

روتے روتے سرِیتا اور بھی دلکش ہو گئی۔ اُس کے رُخسار جذبات کی سُرخی سے تمتمانے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں لال ڈورے شفق کی دھاریوں کی طرح چمکنے لگے۔ اور بھیگی پلکوں پر آنسو شبنم کے موتیوں کی طرح جگمگانے لگے۔ میں نے اُسے سہارا دیکر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اور اُس کا

چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیکر اُس کے ہونٹوں کا سارا زہر چوس لیا۔ اب وہ ہونٹ کتنے نرم اور ملائم تھے۔ آنسوؤں کے دھارے میں عورت کتنی کمزور اور ملائم ہوجاتی ہے، جیسے بارش میں بھیگ کر دھرتی نرم پڑجاتی ہے۔ اُس وقت عورت کی کمزوری میں ایک عجیب و غریب خطرناک کیفیت بھی ہوتی ہے، جس سے بچاؤ کی صورت مشکل سے سوجھتی ہے۔ میں تو روتی ہوئی عورت اور مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اُس سے پیار کئے بغیر رہ بھی نہیں سکتا! ایسا احمق ہوں میں!

میں نے سریتا سے پوچھا۔ "کچھ یاد آیا؟"

"رہگذر یاد آیا!" وہ سر جھکا کے بولی۔

تم عورتوں میں بس یہی خامی ہے۔ میں ذرا غصّے سے بولا۔ ایسے نفسیاتی موقعے پر رو دیتی ہو کہ آدمی بالکل بے بس ہوجاتا ہے۔ مجھے دیکھو اچھا بھلا اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ تمہیں کسی طرح پریشان نہیں کر رہا تھا۔ مگر تم نے اپنی حرکت سے میرا زہد غارت کردیا۔ بس اِسلئے مجھے تم لوگوں سے نفرت ہے!

میں اُس سے الگ ہو کے بیٹھ گیا۔ سچ مچ مجھے بہت غصّہ آرہا تھا۔

سریتا مسکرا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے بی اے کیا ہے؟"

وہ بولی: "بی اے کیا ہے اُس کے بعد لا بھی کیا ہے!"

"لا کیا ہے تو وکیل کیوں نہ بن گئیں؟"

"اِس دُنیا میں انصاف کہاں ہے؟" سریتا نے جواب دیا۔

"انصاف نہ سہی۔ وکالت میں تمہیں عزّت تو ملتی!"

"اِس دُنیا میں وہ عورت بڑی خوش قسمت ہوتی ہے جسے عزّت ملتی ہے!"

"اچھا چلو عزّت نہ سہی، پیسے ہی ملتے۔ اِس بیرہ گیری سے تو زیادہ ہی ملتے۔"

"کیا بات کرتے ہو مسٹر؟ —— تمہیں کچھ پتہ ہے؟" —— سریتا غُصّے سے بولی۔ "اِس بیرہ گیری میں معمولی سے معمولی طالب علم بھی جو کافی پینے آتا ہے۔ مجھے ایک روپے سے کم کا ٹِپ نہیں دیتا۔ ایک صاحب ہیں وہ جب آتے ہیں پانچ روپے کا ٹِپ دیکر جاتے ہیں، چاہے بل چھ آنے کا ہو۔ ایک بزنس مین ہے وہ گذشتہ پندرہ دن سے رات کو ڈنر کھانے آتا ہے اور سو روپے کا ٹِپ میرے ہاتھ میں ہر روز تھما دیتا ہے، ہر روز شام کے وقت اُس کی گاڑی باہر میرا اِنتظار کرتی ہے۔ آج پندرہ روز ہو گئے!"

"پھر؟" میں نے پُوچھا۔

"ابھی دو چار مہینے اُس کی گاڑی اور انتظار کریگی۔" وہ بڑی نخوت سے

بولی۔ "میں تم لوگوں سے گِن گِن کر انتقام لوں گی"

"اب تک کتنے انتقام گِن چکی ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ جملہ بہت تیز تھا اُس کے لیئے۔ اُس نے زور کا دھپ میری پیٹھ پر مارا۔ پھر ایک اور دیا۔ پھر ایک اور دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیئے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے۔ جب جا کے وہ کہیں رُکی۔ اِس دَوران میں اُس نے مجھے بہت سی بے ضرر قسم کی گالیاں بھی دیں جنھیں میں نے ہنس کر سُن لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی "سونے کے علاوہ کیا عورتیں بھی تم سمگل کرتے ہو؟"

میں نے کہا "ہر قیمتی چیز سمگل ہوتی ہے۔ چاہو تو میں تمہیں ابھی گاڑی سے جادو کے تاش کے پتّے کی طرح غائب کر دوں، اور صبح جب تمہاری آنکھ کھُلے تو تم اپنے آپ کو بغداد کے کسی کوچے میں، روم کے کسی بازار میں یا بونس ایرز کے کسی کلفے میں پاؤ گی! ________"

"یوں!" میں نے چٹکی بجائی۔

"نہ بابا!" سرِیتا کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی "میں یہیں ٹھیک ہوں"

گاڑی اب پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اُدھر جا رہی تھی جہاں پر

میرے دوست آنند کا گھر تھا۔ میں نے سوئچ دبا کر گاڑی کے اندر روشنی کی اور سریتا سے کہا۔ "پف پاؤڈر کے الّم غلّم سے اپنے چہرے کی مرمّت کر لو۔ آنند کا گھر قریب آرہا ہے۔"
سریتا نے کمپیکٹ کھولا۔

بنگلے کے پورچ میں ہیں آنند کا بیرہ مل گیا۔ اُس سے پُوچھنے سے پتہ چلا کہ آنند کی بیوی تو گھر میں نہیں ہے۔ وہ نکھ پتی فلم ایکٹرس تاج میں کسی پارٹی میں شامل ہونے کے لئے شام ہی سے غائب ہے۔
"اور وہ نکھٹّو کہاں ہے؟" میں نے بیرے سے پُوچھا۔
"کوئی نکھٹّو صاحب اِدھر نہیں آئے!" بیرے نے حیرانی سے جواب دیا۔
"ارے وہ لالہ بُجگڑ آنند کو میں پوچھتا ہوں۔"
"آنند صاحب تو اپنے بیڈ رُوم میں ہیں۔"
"کیا کر رہے ہیں؟"
"وِھسکی پی رہے ہیں!"
میں نے سریتا کو بازو سے گھسیٹ کر کہا۔ "جلدی چلو سریتا۔ ورنہ وہ کم بخت ساری بوتل ختم کر جائے گا!"
خوش رُو، خوش اخلاق، خوش نصیب آنند اپنے کمرے میں اکیلا

وہسکی پی رہا تھا۔ جب ہم اطلاع دیئے بغیر اُس کے کمرے میں پہنچے تو وہ اپنا پیگ بنا کر اُسے ہونٹوں تک لیجانے والا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹھکا، چونکا ——— اُس کا گلاس یکایک اُس کے ہاتھوں سے گر کر فرش پر چکنا چُور ہو گیا۔

میں نے ہنس کر کہا: "ایسی پھٹی پھٹی نگاہوں سے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں جیون! — جیون!!۔ کوئی بھوت نہیں ہوں۔"

اُس نے آہستہ سے کہا: "ایک لمحے کے لئے میں بھی یہی سمجھا۔ میں کسی بھوت یا چھلاوے کو دیکھ رہا ہوں!"

میں نے تعارف کرایا: "یہ سریتا ہیں ——— یہ آنند ہیں۔"

آنند نے رُک رُک کر آہستہ سے پُوچھا۔ "یہ — یہ ——— تمہاری بیوی ہیں؟"

سریتا بڑی تیزی سے بولی۔ "نہیں صاحب! ——— میں اِن کی محبوبہ ہوں! ایک رات کی محبوبہ!"

اِس کے بعد وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "ایک پیگ بنائیے!"

رات مدھم اور ملائم یوں دھیرے دھیرے گزر رہی تھی، جیسے

وھسکی حلق سے گزرتی ہے۔ اِس رات میں پُرانے پھُولوں کی خوشبو تھی۔ اور ایک افسردہ سا نشہ تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ اپنے اپنے خیالوں میں گُم۔ اور اپنے اپنے پیالوں میں کھوئے ہوئے اور اپنے اپنے سپنوں میں سوئے ہوئے۔

یکایک سَریتا نے چونک کر کہا۔" وِھسکی ختم ہو گئی!"

آنند نے اُٹھ کر دوسری بوتل نکالی۔ سَریتا بولی "اِس بیڈ رُوم میں بڑی گھٹن ہے۔ کہیں باہر نہ چلیں؟"

ہم لوگ وِھسکی لئے باہر آ گئے۔ اور بنگلے کی مغربی سیڑھیوں پر باہر بیٹھ گئے۔ میں اور سَریتا پاس پاس بیٹھے۔ آنند ہم سے نیچے پتھّر کے زینے پر یوں بیٹھا جہاں سے وہ ہم دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ سامنے سبز نوکیلے بانسوں کا جھُنڈ ایک چینی پنکھے کی طرح کھُلا ہوا تھا۔ بانسوں کے جھُنڈ سے پرے ڈھلوان باغ تھا جس کے نادیدہ پھُولوں کی بھینی بھینی مہک ہمارے احساس میں گھُلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر میں چاند آئے گا!" آنند نے آہستہ سے کہا۔

اور چُپ ہو گیا۔ کسی نے اُس کی بات کا جواب نہ دیا۔

ایک لمبے وقفے کے بعد سَریتا نے پُوچھا۔" آپ کی اہلیہ محترمہ اب تک نہیں آئیں!"

"وہ دیر میں آتی ہیں!"

"اور کبھی کبھی نہیں آتی ہیں؟" سریتا نے پوچھا۔

آنند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں کبھی کبھی نہیں آتی ہیں!"

"کیوں نہیں آتی ہیں؟" سریتا نے پھر پوچھا۔ "فلم لائن سے تو مدت ہوئی وہ کنارہ کش ہو چکیں۔ اب کہاں جاتی ہیں؟"

"جانے وہ کہاں جاتی ہیں؟ مگر مجھے وِھسکی دے جاتی ہیں۔ یہ بنگلہ دے جاتی ہیں۔ کار دے جاتی ہیں!"

"تم اپنی زندگی سے خوش ہو!"

آنند نے ایک بہت بڑا گھونٹ پی کر کہا۔ "بہت مدت ہوئی یہ سوال میرے سامنے آیا تھا۔ خوشی یا دولت؟ ـــــ میں نے دولت کو چُن لیا۔ مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تم اِنسان ہو کہ سُوّر؟" یکایک سریتا چیخ اُٹھی۔

آنند وِھسکی سے بھرا ہوا گلاس اُس کے مُنھ پر مارنے والا تھا۔ کہ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آدھی سے زیادہ وِھسکی میرے ہاتھ پر چھلک گئی۔ آنند پیچھے ہٹ گیا۔ اور ہماری طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا۔

میں نے سریتا سے کہا۔ "یہ تمہاری انتہائی بدتمیزی ہے۔ شراب کے نشے میں تم اپنے آپ کو بھولتی جا رہی ہو۔"

"بھولنا چاہتی ہوں۔ مگر بھول نہیں سکتی!"

"آنند سے معافی مانگو۔"

یکایک آنند اُٹھ بیٹھا۔ بڑی سختی سے بولا "نہیں نہیں معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ آج رات کے لئے یہ گھر تمہارے حوالے ہے۔"

اُس نے گلاس ختم کر کے گلاس کو بانسوں کے جُھنڈ میں پھینک دیا۔ اور جلدی سے وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہیں رُکا۔ تھوڑی دیر میں اُسکی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

سریتا ہولے ہولے ہنسنے لگی۔ میں نے گلاس اُس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اور مت پیو۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔"

آنند کی کار نیچے ڈھلوان سڑک پر اُترتی جا رہی تھی۔ کار کی پُشت کی سُرخ بتّیاں کبھی درختوں میں چُھپتیں کبھی سڑک پر چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ پھر بتّیاں دُور چلی گئیں۔ پھر بتّیاں گُم ہو گئیں۔ پھر سڑک پر اندھیرے کے سوا کچھ نہ رہا۔

سریتا گھٹنوں میں مُنہ چُھپا کے دھیرے دھیرے سِسکنے لگی۔

یکایک نیم چاند بانسوں کے جُھنڈ سے اُبھر آیا۔ اور بانس کی ایک شاخ کا سہارا لیکر سریتا کی طرف حیران و پریشان دیکھنے لگا۔

یکایک سریتا نے سر اُٹھایا۔ اور چاند کو شرربار نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "کیا دیکھتے ہو میری طرف؟ میری ہنسی اُڑاتے ہو۔ سالے دھوکے باز جھوٹے فریبی چاند!"

سریتا نے گلاس کھینچ کر چاند کے مُنھ پر مارا۔ گلاس بانسوں کے جھنڈ میں جاگرا۔ ایک چھناکے سے اُس کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ شاخیں اپنی جگہ پر ہلیں۔ پھر ساکت ہو گئیں۔

سریتا گلوگیر لہجے میں بولی: "کہیں کچھ ٹوٹتا ہے۔ پھر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ شاخیں ہلتی ہیں۔ پھر اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتی ہیں۔"

وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رُونے لگی۔

میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھالیا۔ نشے میں اُس کا مُنھ لال تھا۔ اور اُس کا سارا جسم بانس کی ٹہنی کی طرح کانپ رہا تھا۔ بیڈرُوم کے قریب پہنچ کر وہ تڑپ کر میرے بازوؤں سے نکل گئی۔ اور میری طرف اُنگلی اُٹھا کے بولی۔ "میں اِس بیڈرُوم میں سوؤں گی۔ تم اُس بیڈ روم میں!"

"کیوں؟"

"میں آج رات اپنے غم کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

"تمہارا غم کیا ہے۔"

"تمہیں کیوں بتاؤں، تم میرے کون ہوتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں تو اس بیڈ رُوم میں سوؤں گا۔"

سریتا نے شعلہ بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اگر تم انسان ہو تو دوسرے بیڈ رُوم میں جاکے سو جاؤ گے۔ اگر سُور ہو تو میرے کمرے میں آؤ گے۔"

اتنا کہہ کر سریتا نے جلدی سے اپنے بیڈ رُوم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

میں دھیرے دھیرے دوسرے بیڈ رُوم میں جانے لگا۔

صبح ہوئی تو سریتا جا چکی تھی۔ ٹیبل پر ایک خط پڑا تھا۔ خط پر چھینی پنکھا رکھا تھا۔ میں نے خط اُٹھایا۔ لکھا تھا۔

"میں نے سوچا تھا۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔
مگر عورت بھلانے پر بھی کچھ بھول نہیں سکتی۔
ہر زخم اُس کی رُوح میں ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔
کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ سدا رِستا رہتا ہے۔!
—— آنند میرا شوہر ہے۔ اُس نے محبّت کو
تج دیا۔ اور دولت سے شادی کر لی۔ آج میں
اُس سے انتقام لینے آئی تھی۔ مگر عین وقت پر

میرے اندر کی عورت نے میرا ساتھ نہ دیا۔
میرے خریدار میں تجھ سے معافی مانگتی ہوں!
میں بمبئی سے بہت دُور جا رہی ہوں۔ ایک
چھوٹے سے دُور اُفتادہ شہر میں میرا ایک بچہ
پل رہا ہے۔ میرا اور آنند کا بچہ۔ میں اُس کے
پاس جا رہی ہوں۔"

"سریتا"

کئی برس گزر گئے۔ وہ چینی پنکھا آج بھی میرے پاس ہے۔
اُسے کھولتا ہوں تو اُس میں سے آج بھی ایک انجانی سنی مہک
آتی ہے۔ پھر تیز اور سرد اور طوفانی ہوائیں چلنے لگتی ہیں ۔ اور
کوئی بڑی دِلدوز گہری اور گمبھیر آواز میں مجھ سے کہتا ہے ۔
اے اجنبی۔
میں تیرے لئے کوانتگ کے برفیلے پہاڑوں پر جاؤں گی۔
اور طوفانی جھکڑوں کا سامنا کروں گی۔
سرد چٹانوں میں رہوں گی۔

اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلوں گی۔
اور رنگ کے سُرخ پھُولوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کروں گی۔
کیونکہ میں عورت ہوں!

اَشوکؔ کِی مَوتؔ

اشوک کی موت

سارے محل میں سناٹا تھا۔ سات دن اور سات راتوں سے اشوک بستر مرگ پر پڑا تھا۔ لیکن اُس کا دم نہ نکلتا تھا۔ اُس کی ٹانگیں حرکت نہ کرتی تھیں۔ اُس کا دھڑ حرکت نہ کرتا تھا۔ اُس کے بازو ہل نہ سکتے تھے۔ صرف سانس کی حرکت باقی تھی۔ اور آنکھوں کی پُتلیاں روشن تھیں۔ اور زبان دھیرے دھیرے کام کرتی تھی۔ شہر کے سارے وید اُسکا علاج کر چکے تھے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے، برما سے، چین سے، لنکا سے، سیام سے، ہند چینی سے بڑے بڑے دانش مند حکیم آئے تھے۔ غیر ملکوں کی حکمت اور اپنی زندگی کا سارا تجربہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن اشوک پر کسی دوا کا اثر نہ ہوا۔ بیماری بڑھتی گئی، اور وہ موت کے گھاٹ اُترتا گیا۔ آخر وہ وقت آیا جب ہر کسی نے جواب دے دیا۔ جب دوا دارو والے جنتر منتر والے، جھاڑ پھونک والے سب لوگ نااُمید ہو گئے اور ہر ایک نے کہدیا۔ مہاراج ادھیراج اشوک اب بچ نہیں سکتے۔ اب اُن کو جانا ہی ہوگا۔ اپنا محل، اپنا ملک، اپنا دھرم، اپنا فلسفہ، گیان دھیان اپنی

پنج شیلا۔ پتھر کے کتبے، مینار، لاٹ، فتوحات، شہرت، رعایا بچے بالے ہر چیز کو یہیں چھوڑ کے جانا ہو گا۔ کوئی یاد بھی ساتھ نہ جائے گی کیونکہ جب دَم نکل جاتا ہے تو اِس جیون کی ہر یاد اور اِس زندگی کی ہر مسرّت، اور اِس وقت کا ہر درد اور اِس زمانے کی ہر ادا وہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور آدمی وہیں پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ چلا تھا۔ صرف زمین ہی گول نہیں، صرف سُورج ہی گول نہیں، صرف نظامِ شمسی اور یہ کائنات اور یہ وقت کا بہاؤ ہی گول نہیں ہے اِنسان کی زندگی بھی گول ہے۔ ایک بہت بڑی گولائی کے اندر ایک نہایت چھوٹی سی، ذرّے سے بھی مختصر گولائی، اشوک اعظم تھے۔ لیکن مَوت سے بڑا کوئی اعظم نہیں ہے!

یہ بات تو نہیں ہے کہ اشوک کو اِس کا احساس نہیں تھا۔ وہ بُدھ کے پُجاری تھے۔ اور مَوت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن نہ ڈرنے کی بات اور ہے۔ اور مر جانا دوسری بات ہے۔ اور اِن دونوں باتوں میں بہت بُعد ہے۔ اور اِس بات کا پتہ زندگی میں نہیں چلتا۔ جب تک تنے میں رَس رہتا ہے، پتّے ہرے اور چکنے رہتے ہیں۔ شاخوں پر پھول اور پَھل آتے ہیں۔ بُلبُل نغمہ سرا ہوتی ہے، پرندے گھونسلے بناتے ہیں، اِنسان سائے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں، اور درخت زندگی کی فتح اور اُس کے غرور سے سرشار ہو کر آسمان سے آنکھیں مِلا کر بات کرتا ہے۔ اُس وقت اِس بات

کا اِحساس بھی نہیں ہوتا کہ اِس سرشاری اور سرمستی کی کیفیت میں بھی اُسکی ضد موجود ہے۔ اور یہ ضد تنے کی پور پور میں اور زندگی کی رگ رگ میں رچی رہتی ہے۔ ہر عمل اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

اشوک کو اِس بات کا اِحساس تو تھا۔ لیکن اُنہیں یہ معلوم نہیں تھا، کہ جب زندگی موت کی حدود کو چھُوئیگی تو یوں مچل مچل جائے گی۔ اور اُمید کے آخری تنکے کو یوں دانتوں میں دبا کر مرنے سے اِنکار کردے گی۔ کیا حاصل نہیں کیا میں نے؟ کتنی بھرپُور زندگی رہی ہے میری۔ کتنے خوبصورت طریقے سے جیا ہوں میں۔ اِنسانی تاریخ کے ہزاروں سال بہت ہی کم ایسے خوش قسمت اِنسانوں کو گِنا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی میں راجہ ہوتے ہوئے بھی دیوتا کی طرح پُوجے گئے ہوں۔ وہ کون سی خواہش تھی میری جو پُوری نہ ہوئی ہو۔ عزت، دَولت، شہرت، محبت، ہر اپسرا کے ساتھ میری زندگی نے بھرپُور رقص کیا ہے۔ دھرم، نیک نامی، رُوح کا وہ گہرا گیان جو بُدھ کے عرفان نے مجھے دیا۔ جس کی جوت نہ صرف میں نے اپنے دل میں جگائی بلکہ چہار دانگ عالم میں پھیلائی۔ اُس روشنی کو میں نے اپنی رُوح میں سمو کر جذب کرلیا۔ اِس طرح سے میرا ہر عمل میری رُوح کی آواز بن گیا۔ اور مجھے وہ مسرت اور خوشی اِس دُنیا میں ملی، جس کی لوگ جنّت میں توقع کرتے ہیں۔ اِس سے زیادہ مجھے کیا چاہیئے۔ پھر بھی یہ زندگی ہے کہ اپنی بقا کے لئے لڑے جاتی ہے۔ یہ دَم ہے

کہ بے دَم ہوتے ہوتے بھی ٹھونک کر قائم ہے۔ یہ جان نکلتی کیوں نہیں؟ یہ حرکت بند کیوں نہیں ہوتی؟ میری گردن کے حلقوں میں یہ اضطراب کیسا ہے؟ بُدھ نے مجھے نِروان کا سبق دیا۔ پھر بھی مجھے نِروان حاصل کیوں نہیں ہوتا؟ سات دن اور سات راتوں سے میں اِس بستر مرگ پر تڑپ رہا ہوں۔ ٹانگیں کام نہیں کرتیں۔ بازو کام نہیں کرتے۔ تنے کا رَس سُوکھ گیا۔ صرف آنکھوں میں روشنی اور زبان میں گویائی ذرا سی بس اِس طرح باقی ہے جس طرح جڑ سے اُکھڑے ہوئے سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر آخری دو پتّے ہرے رہ جاتے ہیں۔ اب ختم ہو جائے یہ زندگی وہ رِشتہ ٹوٹ جائے جو پتّے کو شاخ سے باندھ کے رکھتا ہے۔ اور میری رُوح ایک کھڑکھڑاتے ہوئے پتّے کی طرح فضا میں پرواز کر جائے!! میرا ہر احساس آسودہ ہو چکا عرفان کے ہر گوشہ میری نگاہوں میں آچکا۔ اب کیا باقی ہے جس کے لئے یہ زندگی زندہ ہے۔ یہ آخری سانس سات دن اور سات راتوں سے کس لئے حلق میں اٹکا ہوا ہے؟

اِن سات دن اور سات راتوں میں اشوک کے دماغ نے اِس اَمر پر بہت سوچا، لیکن اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور وہ جو سلطنت کے ہر کام گیان دھیان کی ہر گتھّی خود سُلجھاتا تھا۔ موت اور زندگی کی آخری حد پر کھڑا ہوا ایک کربناک تذبذب سے دوچار تھا۔

اُس نے اپنی پوری زندگی پر نگاہ ڈالی جو کھیٹے کی ہر کیل اپنی جگہ سلامت تھی۔
ہر چُول اپنی جگہ ٹھکی ہوئی تھی۔ سلطنت کا ہر کام خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔
اشوک نے پھر ایک بار دُہرایا.......

"مہامنتری۔ کیا تم نے میری شدید علالت کا اعلان کر دیا ہے؟"

"ہاں مہاراج!"

"کیا جنتا جانتی ہے کہ مہاراج اب بچ نہ سکیں گے؟"

"ہاں مہاراج! مگر ——"

"مگر کو جانے دو... میں سمجھتا ہوں۔"

اشوک چُپ ہو گئے۔ پھر بولے

"میرا بیٹا بندوسار کہاں ہے؟"

"حضور وہ اپنے کمرے میں بیٹھے رُو رہے ہیں۔"

"اگر وہ رُو رہے ہیں تو اُنہیں رُونے دو۔ لیکن اگر شطرنج کھیل رہے ہوں تو اُنہیں میرے سامنے بُلا لاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد راجکمار بندوسار ہاتھ جوڑ کر اپنے پِتا کے سامنے کھڑے تھے۔

"مہامنتری۔ تم نے میری پرجا میں اعلان کر دیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد مہاراجکمار بندوسار ہندوستان کے چکرورتی مہاراج ہوں گے؟"

"ہاں مہاراج - ہندوستان کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں مُنادی کر دی گئی ہے. باہر مُلکوں میں سفیر بھیج دیئے گئے ہیں. جن راجکماروں سے بغاوت کا اندیشہ تھا، اُنھیں قید کر دیا گیا ہے۔"

"بندو سار تمہیں اِس مہامنتری سے تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

"نہیں پتاجی! اِن کے گھر میں ایک بھی بالک نہیں ہے - یہ میری گدی چھین کر کیا کریں گے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اشوک چُپ ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد اُنھوں نے مہاپروہت کو بُلا کے پُوچھا۔

"سب سامان تیار ہے"؟

"ہاں مالک! کاشمیر سے زعفران آیا ہے - کیرل سے صندل کی لکڑی آئی ہے - مگدھ سے گھی آیا ہے - گاندھار سے پھل آئے ہیں. بنارس سے ریشم کا کفن آیا ہے - ہندو پروہت اور بُدھ بھکشو بھگوان کے چرنوں میں آپکی درازئی عمر کی دُعا کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب - تو اب مجھے مر جانا چاہئے. لیکن پھر بھی میری جان کیوں نہیں نکلتی؟"

مہاپروہت نے کہا۔ آپ نہیں مریں گے. کلیان کاری بُدھ کا آپ کو

آشیرواد ہے۔

اشوک نے سر ہلا کے کہا۔

"ہر آشیرواد کو ایک دن ختم ہونا ہے۔ ہر طرح کا گیان اور فلسفہ اور دھیان ایک دن اپنی موت کو پہنچتا ہے۔ اِس سنسار میں ہر خیال کی موت ہے۔ ایک دن وہ بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں، اور کفن پہنا کر جلا دیے جاتے ہیں!"

"لکھ لو۔ لکھ لو!! مہا پروھت چلّایا۔ مہا اشوک کی بانی!"

بھوج پتر پر ایک ادیب روتے ہوئے مہا پُرش کی بانی لکھنے لگا۔

اشوک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مر گئے ہوں۔ جسم ساکت، آنکھیں بند، ہونٹ بند، بازو اور ٹانگیں مُردوں کی طرح اکڑی ہوئیں۔ بُوڑھے جسم پر موت کی سی زردی اور سیاہی۔

شاہی ویدوں نے آگے بڑھ کر نبض ٹٹولنا چاہی۔ سات دن اور سات راتوں سے وہ لوگ اِسی کمرے میں جاگ رہے تھے۔ اور ایک پلک نہ سوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ اور زبان پر کانٹے سے محسوس ہوتے تھے۔ اور وہ اِس قدر تھکے ہوئے تھے کہ واقعی دل سے دُعا کر رہے تھے کہ اِس جسدِ خاکی سے

دیکھیں کب جان نکلے اور کب گھر جا کر گہری نیندیں سو جائیں۔ اِس کا بھی گمان تھا کہ اگر دو چار روز اور اشوک مہاراج اِسی طرح زندہ اور مُردہ رہے تو اِن ویدوں میں سے کسی کا دَم نکل جائے گا۔

ایک شاہی وید نے نبض کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اشوک نے دھیرے سے کہا۔ "رہنے دو۔ ابھی زندہ ہوں۔"

وید گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اشوک نے آنکھیں کھولے بغیر پُوچھا۔

"اب کیا وقت ہو گیا؟"

سب سے بڑے وید نے کہا۔ "سورج غروب ہو رہا ہے۔"

اشوک نے کہا۔ "مجھے جھیل پر لے چلو۔ شاید سُورج کو جاتے دیکھ کر میرے دل میں بھی جانے کی خواہش اِس شدّت سے اُبھر آئے کہ میں اِس جانکنی کی حالت سے گذر کر گویا سورج کے ساتھ ہی دوسری دُنیا میں چلا جاؤں۔"

اشوک کے جسم کو شاہی رَتھ میں لِٹا دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ گھوڑوں کو ڈُلکی چلا کر اُسے جھیل کے کنارے لے جایا گیا۔

یہ جھیل ایک خوبصورت پہاڑی وادی میں تھی۔ جھیل کے بیچوں بیچ اشوک کا راج محل تھا۔ چاروں طرف جھیل کا پانی تھا۔ اور صرف مشرق میں ایک سڑک پہاڑ سے راج محل تک جھیل کو کشتیوں سے پاٹ کر بنائی گئی

تھی۔ سُورج لال بھبھوکا تھا۔ مغرب میں کانچ کی طرح سبک بادل سُرخ روشنی سے معمور جامِ شراب کی طرح چھلک رہے تھے۔ نُور کا ایک سیلاب تھا کہ جھیل میں اُمڈا چلا آرہا تھا۔ محل کی بُرجیاں اور کلس سونے کے پانی سے جگمگائے ہوئے .....

کس قدر خوبصورت ہے یہ دُنیا! اشوک نے ایک آہ بھر کے سوچا۔ اور اُسے یاد آیا کہ کبھی یہاں پر محل نہ تھا کشتیوں کا پُل نہ تھا۔ شہر نہ تھا۔ وہ خود اشوک آج کا اشوک نہ تھا۔ بائیس برس کا جوان شہزادہ تھا۔ جو شِکار کی تلاش میں گھوڑے پر سوار دوڑتے دوڑتے اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر اِدھر آنکلا تھا۔ اِسی طرح شام کا وقت تھا۔ سُورج کے غروب ہونے میں بس یہی رعنائی تھی۔ صرف جہاں پر آج اُس کا رتھ کھڑا ہے۔ وہاں پر ایک ماہی گیر کا جھونپڑا تھا۔ اور ایک لڑکی اپنے باپ کے ساتھ جھیل میں سے جال کھینچ رہی تھی، اور اُس کا سارا بدن ایک سُنہری کمان کی طرح جھیل کے پانیوں پر کھنچا ہوا یوں ڈول رہا تھا جیسے کنول کا پُھول لہروں کے ہلکورے کھاتے ہوئے سطحِ آب پر رقص کرتا ہے۔

وہ رقص آج کہاں ہے؟ وہ مچھلی کدھر گئی؟ کس جھیل میں؟ کس تالاب میں یا کانچ کے کس پیالے میں رقص کر رہی ہے؟

اشوک نے آہ بھر کے کہا۔

"مجھے واپس لے چلو۔ یہاں آ کے تو میں جوان ہوا جاتا ہوں!"
آدھی رات اور گزر گئی۔
محل کی غلام گردشوں میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ اشوک کا کمرہ اگر اور لوبان سے مہکا ہوا تھا۔ دھیمے دھیمے سُروں میں بھکشو پاٹھ کر رہے تھے۔ اشوک کے سر کے پاس ایک بڑی کھڑکی کھلی تھی۔ کھڑکی کے آس پاس سنکیسر کے پیڑ کی ایک شاخ لال لال پھولوں کی وینی سی سجائے کھڑی تھی۔ اس وینی کے پرے کھلے آسمان میں تارے گویا آنکھیں جھپک رہے تھے۔
کتنی خاموشی ہے۔ کتنا پیارا سنّاٹا ہے۔ اشوک نے سوچا۔ اس شہد بھری غنودگی میں اگر کہیں سے ایک دھیما دھیما رقص شروع ہو۔ اور میری زندگی اُسی رقص کی تال پر چکّر کھاتے ہوئے دھیمے دھیمے یوں غائب ہو جائے۔ جیسے آسمان کی پہنائی میں اپسرائیں رقص کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں۔ تو کتنا اچھّا ہو۔
اشوک نے حکم دیا۔ اور رقص شروع ہو گیا۔
رقاصائیں کچّی نیند سے جاگی تھیں۔ اس لئے ابھی تک اُن کی آنکھوں میں نیند کا خُمار تھا۔ اور نرت اس طرح کا تھا جیسے ہر رقاصہ کا بدن ٹوٹ رہا ہو۔ اور ٹوٹ کر انگڑائی میں منتشر ہو رہا ہو۔ تال میں

اُن خوابیدہ جذبوں کی مہک بھی جو جوان رات کے بستر پر جاگتے ہیں۔ اِن رقاصاؤں کے ہر خم میں کس قدر خطرناک بُلاوا ہے۔ ہر آرزو سیراب ہو چکی۔ ہر ہوس آسودہ ہو چکی۔ اب جسم و جاں میں عالمِ نشاط کی کوئی کیفیت باقی نہیں۔ پھر بھی نگاہ کیسے رُک جاتی ہے۔ عورت کے ہر خم میں کیسے اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ گیسوئے مشکبار گویا اپنی کالی آنکھوں سے میری طرف جھانکتے ہیں۔ اور اجنبی عطر کا پیام دیتے ہیں۔ اب بھی۔ آج بھی زندگی کے آخری دروازے پر بھی، زندگی عورت کے فریب میں مجھے بُلاتی ہے؟

اشوک نے آہ بھری۔ "ایسے تو میں کبھی مر نہ سکوں گا۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے رقص روک دیا۔ لَے تال سُر ہاتھ کی ایک حرکت سے بکھر گئے۔ ٹوٹ گئے۔ خاموش ہو گئے۔ رقاصاؤں کی میٹھی میٹھی جھانجھروں کی صدا غلام گردشوں میں گونج گونج کر دب گئی۔ اور پھر محل میں سناٹا چھا گیا۔

باقی رات اشوک نے انتہائی کرب میں گزاری۔ اور جانکنی کے گہرے درد سے بے تاب ہو کر اُس نے بار بار بھگوان بُدھ سے التجا کی کہ وہ اُسے نِروان کا راستہ دکھائیں۔

اشوک نے ویدوں کے اصرار کے باوجود ہر قسم کی دوا لینے سے اِنکار کر دیا تھا۔ بے بس وید، منتری اور کرمچاری، محل کی رانیاں اور عورتیں، شہزادے اور جاگیردار ہاتھ باندھے محل کے اندر اور محل کے باہر زندگی

اور موت کے اِس معرکے کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ جنتا اپنے اپنے گھروں میں خوف و ہراس سے دبکی پڑی تھی۔ اُن کے کان شاہی محل کے گھنٹے کی طرف تھے۔ جو اشوک کی موت کے اعلان کو سارے شہر میں پھیلا دے گا۔

لیکن ساری رات گذر گئی۔ اور اشوک نہ مرا۔ اُس کا بے کار۔ بے آسرا جسم موت اور زندگی کے تھپیڑوں میں ایک شکستہ کشتی کی طرح ڈولتا رہا۔ نہ وہ ڈوبا نہ کنارے پر لگا۔ رُوح بار بار جسمِ خاکی سے جست کر کے نکلنے کی کوشش کرتی۔ لیکن جانے وہ کیا چیز تھی۔ جو اُسے ابھی تک اُس ناکارہ جسم سے باندھے ہوئے تھی۔ بس صِرف ایک تار تھا، ایک سانس تھا، ایک دھاگا تھا، دِل کی ایک ہی دھڑکن تھی جو زندگی کو جسم سے الگ نہ ہونے دیتی تھی۔!

جب صُبح ہونے والی تھی تو اشوک نے اپنے آپ کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ اُس نے اپنے جسم و جان میں ایک عجیب سی تازگی کو محسوس کیا۔ سات دِنوں اور سات راتوں کے بعد آٹھویں صُبح کو پہلی بار اُس کے نیلے ہونٹوں پر دُوج کے چاند کی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اُس نے حُکم دیا کہ اُس کا بستر باہر باغ میں سیب کے درخت کے نیچے سجایا جائے۔ وہ اپنی آنکھوں سے صُبح دیکھے گا۔ رات کو جاتے اور دِن کو آتے دیکھے گا۔ شاید اِس آنے اور جانے کے دَوران میں اُس کی رُوح کو اِس کشمکشِ حیات سے نجات مل جائے!

خدّام نے اُسی وقت اُس کے حکم کی تعمیل کی۔

ابھی صبح آئی نہ تھی۔ جب اشوک کا بستر شاہی محل کے پائیں باغ میں سیب کے پیڑ کے نیچے لگا دیا گیا۔ ابھی رات کا اندھیارا باقی تھا۔ ابھی پرندے بولے نہ تھے۔ چڑیاں چہچہائیں نہ تھیں۔ کوّوں نے پر پھڑپھڑائے نہ تھے۔ کلیوں نے آنکھ کھولی نہ تھی۔ عاشق نے اپنے محبوب کا سر اپنے کندھے سے نہ اُٹھایا تھا۔ اُس نیم اندھیارے میں اشوک سیب کے نیم تاریک سایوں میں پڑا پڑا موت کو آواز دینے لگا۔ اے رات! لطیف موت کے سُبک سائے مجھے اپنے ساتھ لے جا۔ اب یہ جانکنی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اے زمین سے اُٹھ کر آسمان کی طرف بھاگنے والے سائے مجھے اپنے جھکتے ہوئے دامن میں چھپا لے۔ میری تھکی ہوئی آسودہ رُوح کسی نئے اُفق کی ناآسودگی بخش، کسی اور ترتیب میں کسی اور صُورت میں، کسی اور تجسیم اور تشکیل کے زاویوں میں مجھے ڈھال دے۔ مگر مجھے یہاں سے نکال لے جا۔ اِس آخری سانس کو میرے جسدِ خاکی سے یوں کھینچ لے جیسے مشاق شکاری اپنے پاؤں سے کانٹا کھینچ لیتا ہے۔ پھر مجھے قرار آجائے گا۔ پھر مجھے نیند آجائے گی۔

بہت دیر تک اشوک اِسی طرح اپنے ہونٹوں میں بڑبڑاتا رہا۔

دیر تک محل کے مودب کرمچاری اُس سے دُور ہٹ کر نگاہیں نیچی کیے ہاتھ باندھے اُسے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ ہولے ہولے رات کی تاریکی اوپر اُٹھتی گئی۔ سیاہی کے دھبے سمٹتے گئے۔ سمٹ کر صورتیں اختیار کرتے گئے۔ صورتوں میں چمک آنے لگی چمک میں حرکت پیدا ہوئی۔ کہیں پر کوئی کلی چٹکی۔ پتّوں کا جھُرمٹ ہوا میں لہکا اور چشم زدن میں سیب کا سیاہ پیڑ سفید سفید پھولوں سے بھرا ہوا نظر آیا۔ فضا میں پرندوں کی چہکاریں سبک خرام بطوں کی طرح تیرنے لگیں۔ اور اُفق تا اُفق زمین اور آسمان روشنی سے منوّر ہو گئے۔

عین اُسی لمحے باغ کے ایک کونے سے ایک زور کی چیخ سُنائی دی۔ اور پھر کوئی بلبلا کر زور زور سے رونے لگا۔

اشوک نے پوچھا۔ کون ہے؟

خُدّام نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ مالی کے گھر بچّہ ہوا ہے۔

بچہ ہوا ہے — ؟ اُسے میرے پاس لاؤ۔

وہ سہمی بلکتی، ہمہماتی ننھّی سی جان جب اشوک کے سینے پر رکھدی گئی تو ایک عجیب سی مُسکراہٹ سے اشوک کا چہرہ منوّر ہو گیا۔ مالی کا ننھّا اشوک کے سینے پر چڑھ کر اپنے چاروں ہاتھ پاؤں

یکبارگی چلاتے ہوئے حرکت کر رہا تھا۔ اور اشوک کے سینے سے دودھ ٹٹول رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اُس کا مُنہ کھلا تھا۔ اور وہ مضبوطی سے روتے ہوئے اپنے پیٹ کے لئے دودھ اور اپنی زندگی کا حق مانگ رہا تھا!

اشوک نے دھیرے سے کہا۔ ٹھیک تو ہے۔ اب میں سمجھا۔ کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے۔ کسی کے آنے کی اُمید نہ ہو تو کوئی جائے کیوں؟ اور اگر کوئی جائیگا ہی نہیں تو کوئی کیسے آسکے گا۔ یہ دنیا اگر ایک ایسی سرائے ہوتی جس میں جانے کا کوئی دروازہ نہ ہوتا صِرف آنے ہی کا دروازہ ہوتا تو پھر ایک دِن وہ آتا جب اِس میں کوئی نہ آسکتا۔ اِس لئے اب جانا ہی چاہئے۔ پھل جب پک جاتا ہے تو شاخ سے ٹپک پڑتا ہے۔ اگر پھل ٹپکے گا نہیں تو دوسری بہار میں اُس شاخ پر نئی کونپل کہاں سے آئے گی اور کونپل پر نیا پھول کہاں سے آئے گا۔

اشوک نے پیار بھری نگاہوں سے ننھے بچے کو دیکھا۔ اُن نگاہوں میں اب کسی طرح کی حسرت نہ تھی۔ کسی طرح کا ملال نہ تھا۔ کسی طرح کی واپسی نہ تھی۔

اشوک نے ننھے سے آنکھیں پھیر کر سیب کے پیڑ کی طرف دیکھا۔

اور دُور اُوپر، دُور اوپر ــــــ دُور اوپر اُس کی آنکھوں میں پھول ہی پھول کھِلتے گئے۔ اِحساس کے روئیں روئیں میں ایک اَجنبی موسیقی کے بُلاوے گو بجنے لگے۔ اور محراب در محراب آفاق کے نئے دروازے اور دریچے اُس کی روح کے لئے کُھلتے گئے۔ یکایک اُس نے اپنے پَر پھیلائے اور سیب کے درخت سے بہت اُوپر فضا میں اُڑ گیا۔!

اوم منی پدمنی اوم

دیوا گیر گھنٹے بجنے لگے۔ کلسوں، بُرجوں، مناروں سے صدائیں بلند ہوئیں "مہاراج اشوک مر گئے! مہاراج اشوک مر گئے"!!

مالن نے دوڑ کر اپنے بچّے کو اشوک کے سینے سے اُٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔!

وزیروں کا کلب

کناٹ پلیس کے گول چکّر کے باہر ایک اور گول چکّر تنبار بھیوں کی دو کانوں کا کھنچا ہوا ہے۔ یہ دوکانیں زیادہ تر کھوکھے کی لکڑیوں، ٹین کی چھتوں یا ترپال کی دیواروں سے تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر دوکانیں ڈھابہ نُما ہوٹلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ سرکاری معاملات کے سلسلے میں عام لوگوں کو اکثر سرکاری دفتروں میں جانا پڑتا ہے۔ یہ لوگ طبعاً کمینے اور عادتاً غلیظ ہوتے ہیں۔ اس لئے نئی دلّی کے صاف ستھرے ہوٹلوں کا کھانا پسند نہیں کرتے، علاوہ ازیں یہ لوگ انتہائی کنجوس اور ندیدے ہوتے ہیں۔ مائی لارڈ اور کلفٹن ایسے ہوٹلوں کے بڑے بل دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی ضروریات کو مدِّنظر رکھ کر کناٹ پلیس کے چکّر کے باہر یہ دوکانیں جنگلی جھاڑیوں کی طرح گویا خود بخود زمین سے اُگ آئی ہیں۔ ان دوکانوں میں آپ وہی بے ترتیبی، انارکی اور بدنظمی پائیں گے جو خودرَو جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ میں ہوتی ہے۔ مجھے ان ڈھابہ نما ہوٹلوں سے سخت نفرت ہے، جہاں تین آنے

میں دو چپاتیاں مل جاتی ہیں اور دال مفت، پانی مفت، اور بیٹھنے کے لیے کرسی اور میز تک مفت۔ اگر غیر ملکی سیاح نئی دلّی کے ان غلیظ ڈھابوں کو دیکھ پائیں تو ہندوستان کے متعلق کیسی رائے قائم کریں! اور آجکل لے دے کے اپنے وطن میں اپنی ایک خارجہ پالیسی ہی تو رہ گئی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کا نام دوسرے ملکوں میں عزت سے لیا جاتا ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں ہے کیا؟ عوام ہیں تو جاہل، دوکاندار ہیں تو بے ایمان، کلرک ہیں تو رشوت خور، مزدور ہیں تو کام چور، عورتیں ہیں تو فیشن کی دلدادہ لوگ ایسی بری عادت کا شکار ہو چکے ہیں کہ غلیظ گھروں میں رہتے ہیں، پھٹے کپڑے پہنتے ہیں اور گندے بازاروں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی غیر ملکی سیاح کو دکھانے کے لیے ہے کیا! ——— ایک تھا بھاکڑہ ننگل ڈیم ——— وہ مکمّل ہی نہیں ہو چکتا۔ یار لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اُسے مکمّل کر دیا گیا تو ہمارے پاس غیر ملکی سیاحوں کو دکھانے کے لیے رہ کیا جائے گا؟ ——— اور دوسری ہے ہماری خارجہ پالیسی ——— جس کی وجہ سے ہمارا بھرم باہر کے ملکوں میں قائم ہے۔ اور یہ خارجہ پالیسی گویا نئی دلّی کی پیداوار ہے۔ جہاں یہ بدصورت ڈھابے عین کناٹ پیلس کے سامنے موجود ہیں۔ جب تک یہ ڈھابے موجود ہیں ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میری ناچیز رائے

میں تو اِن ڈھابوں کو ڈھا دینا چاہیئے ـــــــ خیر یہ تو ایک جُملہ معترضہ تھا۔
اصل بات یہ ہے کہ آجکل جو کچھ میں کہتا ہوں اُس میں جُملہ کم ہوتا ہے
اور معترضہ زیادہ ہوتا ہے۔
میں اصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کناٹ پلیس کے باہر
ایک تپتی دوپہر میں ٹین کی چھت کے نیچے اِسی ڈھابے میں بیٹھا ہوا کھانا
کھا رہا تھا۔ مجھے یہ ڈھابے پسند نہیں ہیں، اور نہ ہی میں اِن میں کھانا
پسند کرتا ہوں، میں ایک شریف، معقول پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بڑے
بڑے آدمیوں سے میری ملاقات رہتی ہے۔ جن میں وزیر، گورنر، لیڈر،
بل اونر اور پنج سالہ پلان کے ممبر شامل ہیں۔ جی نہیں آپ نے غلط سمجھا
میں کسی محکمے میں ڈپٹی سکریٹری نہیں ہوں۔ سیمنٹ کا ٹھیکیدار بھی نہیں
ہوں، کسی وزیر کا بھانجہ بھی نہیں ہوں نہیں نہیں میری بیوی کسی پارلیمنٹ
کی ممبر بھی نہیں ہے۔ میں تو آجکل ایک اخبار میں رپورٹر ہوں اور محض
اِس لئے اِس ذلیل ڈھابے میں کھانا کھانے پر مجبور ہوں۔ کہ مجھے
تقریباً ہر روز سول سکریٹریٹ میں کسی نہ کسی بڑے آدمی کو انٹرویو کرنے
کے لئے جانا پڑتا ہے۔ اور میری جیب اِس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ
مائی لارڈ ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔ ورنہ ایمان کی کہئیے پلش مخمل
کی کُرسیاں اور چینی شاہ چینی کی پلیٹوں میں سجا ہوا کھانا کسے پسند

نہ ہوگا۔؟ ہاں بھئی آدھی پلیٹ دال کی اور دے دو۔ اور یہ چپاتی تو تو بالکل جل گئی ہے۔ اِسے بدل کے لاؤ۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ افوہ کس قدر بُری عادت ہے میری۔ بڑا بڑا بیکار کی باتیں کیا کرتا ہوں۔ اِس سے ایک تو اصل مطلب فوت ہوجاتا ہے اور پھر وقت کتنا برباد ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا۔ آپ آدھے گھنٹے سے ایک ہی لقمہ مُنھ میں ڈالے اُلّو کی طرح میرا مُنھ دیکھ رہے ہیں۔ نہیں نہیں آپ خفا مت ہوجایئے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کھانا بھی کھایئے اور ساتھ ہی میری باتیں بھی سُنتے جایئے۔

ہاں تو میں آپ کو بتارہا تھا کہ ایک روز تپتی دوپہر میں اِسی ڈھابے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ——— ارے ذرا دیکھئے تو یہ کون آدمی آپ کے عقب میں آکے بیٹھا ہے۔ مُڑ کے دیکھئے۔ ارے دیکھئے ضرور مگر اِس طرح تو نہ گھوریئے کہ دوسرا آدمی آپ کو سی آئی ڈی والا سمجھنے لگے۔ آپ نے اِسے پہچانا؟ ذرا غور کیجئے۔ اپنے حافظے پر زور دے کر بتایئے۔ آپ نے اِسے کہاں دیکھا ہے؟ مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں آپ نے اِسے ضرور دیکھا ہوگا۔

کچھ یاد نہیں آتا؟ ——— دراصل اِس میں آپ کا بھی اِتنا قصور نہیں ہے۔ اِس آدمی کی بڑھی ہوئی مونچھیں جو اس کے لبوں پر

نگر رہی ہیں۔ اِس آدمی کے میلے کچیلے کپڑے۔ یہ کھدّر کی میلی غلیظ ٹوپی۔
اُس کی پھٹی پھٹی تار تار مسکراہٹ سے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ
آدمی کبھی اُتر دکھنی پردیس میں وزیرِ زراعت تھا۔ نہ صرف وزیرِ زراعت
بلکہ جیل کا محکمہ بھی اِسی کے پاس تھا۔ اور یہ میں دعویٰ سے کہہ سکتا
ہوں کہ یہ اُن دونوں محکموں کو سنبھالنے کا اہل بھی تھا۔ اِس کا باپ
موضع دھمال پور کا مشہور زمیندار تھا۔ اور وزیر بننے سے پہلے یہ آدمی
سترہ بار جیل جا چکا تھا۔ جن میں سے پہلی بار تو ایک اغوا کے کیس میں
پکڑا گیا تھا۔ دوسری بار اِس پر ڈاکوؤں کی امداد کرنے کا الزام تھا۔
تیسری اور چوتھی بار اِس پر سرکاری مالیے کے غبن کا مقدمہ چلا، اِس کے
بعد جو قومی تحریک چلی تو اِس آدمی کا کردار بالکل ہی بدل گیا۔ یہ غنڈے
سے ایک نیک اور فرشتہ سیرت انسان بن گیا۔ آخری تیرہ جیلیں اِس نے
قومی تحریک کے سلسلے میں کاٹی ہیں۔ میں جماعتی تضاد میں بالکل یقین
نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں اِنسان کے اندر ایک نیک رُوح ہوتی ہے
جسے اگر بیدار کر لیا جائے تو وہی انسان فرشتہ بن جاتا ہے۔ کوئی جماعت
بُری نہیں ہوتی۔ کوئی اِنسان بُرا نہیں ہوتا۔ یہ سب دل میں تبدیلی
پیدا کرنے کی بات ہے۔ اور یہ بات الگ ہے کہ ہمارے مُلک کے عوام
جاہل ہیں۔ اُن کے سر پر جب تک ڈنڈے نہ مارے جائیں وہ تبدیلی

نہیں ہوتے اور جو ہماری آپ کی طرح شریف لوگ ہیں اُن کے لئے لیڈر کا اِشارہ کافی ہے۔

یہ سابق وزیر آجکل بہت بُری حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ دیکھئے اس کی چپّل کتنی گِھسی ہوئی ہے۔ اور اس کا کھدر کا پائجامہ کیسا بوسیدہ ہو رہا ہے، اور اِس کی مونچھیں لبوں کے لعاب سے متواتر گیلی ہو رہی ہیں۔ اِس لئے اُن کا رنگ کیسا بُجھا بُجھا سا ہے۔ جیسے مُونچھیں بالوں کی نہ ہوں، جُوٹ کی ہوں۔ میرے خیال میں تو اِس سابق وزیر کو اپنی مونچھیں رنگوا لینی چاہئیں۔ ورنہ غیر مُلکی سیّاح ان مونچھوں کو دیکھ کر ہمارے مُلک کی خارجہ پالیسی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟۔

قسمت کی بات ہے صاحب کہ یہ وزیر آجکل اِس ڈھابے میں یوں مفلوک الحال بیٹھا ہے۔ در اصل اِس میں اِس کی قسمت کو بھی اتنا دخل نہیں جتنا اِس کی حماقت کو۔ اور سچ پوچھو تو دیانت داری بھی ایک طرح کی حماقت ہی ہے۔ یہ وزیر بے حد دیانت دار تھا۔ اِس لئے اِس حال کو پہنچا۔ بھلا سیاست میں دیانت کا کیا دخل۔ سیاست میں تو دیانت نہیں دیکھی جاتی۔ ایک دوسرے کا مُنھ دیکھا جاتا ہے۔ عوام یہ دیکھتے ہیں کہ لیڈر کیا کہتا ہے۔ لیڈر یہ دیکھتے ہیں کہ وزیر کیا کہتا ہے۔

وزیر یہ دیکھتے ہیں کہ چیف منسٹر کیا کہتا ہے، چیف منسٹر یہ دیکھتا ہے کہ باہر کے ملک کیا کہتے ہیں اسی پر بھارت کی ساکھ قائم ہے۔ تھوڑی سی چٹنی پیاز اور دنیا۔

اس وزیر کا نام الگو رام رلائے ہے جب یہ اُتر دکھن پردیس میں وزیر تھا تو میں اس کا انٹرویو لینے گیا تھا۔ اُس وقت اس کی شان ہی الگ تھی۔ کھدّر کا سفید براق جامہ۔ سر پر کھدّر کی کشتی نما ٹوپی یوں اُونچی تن کے کھڑی تھی جیسے کسی نے اس کے اندر بانس کی کھپچی ڈال کر کھڑا کیا ہو ایسی شبہ اس وزیر کی گردن پر بھی ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں جب میں اس سے انٹرویو لینے گیا تو اس کی سٹینو بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کا قصہ الگ ہے۔ وہ پھر سناؤں گا۔ اُس وقت مجھے اُس حسین نازک اندام سنہری گھومے ہوئے بالوں والی لڑکی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اُونچی ایڑی والے سینڈل پہنے ہوئے جب وہ ٹپ ٹپ کرتی ہوئی چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دفتر کے فرش پر ٹائپ کر رہی ہے۔ دراصل ہاتھوں سے زیادہ اُس کے پاؤں ٹائپ کرتے معلوم ہوتے تھے اور جب وہ کلرکوں کی میزوں کے بیچ میں سے گذرتے ہوئے وزیر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر مسکراتی تھی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک متبسم ڈرافٹ کی مختلف کاربن کاپیاں فضا میں بکھر رہی ہے۔

اُس دن وزیر نے مجھے بہت لمبا انٹرویو دیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اسمبلی میں اُس کا مشہور و معروف زرعی بل پیش ہونے والا تھا۔ وہ انٹرویو کے بیچ میں بار بار سگار پیتا تھا۔ ایک معطر رومال شدہ اور ہاتھوں سے بُنے ہوئے کھدّر کا رومال جیب سے نکال کر اپنا مُنھ پونچھتا تھا۔ اور اِس طرح دُزدیدہ نگاہوں سے اپنی حسین سٹینو کو دیکھتا تھا جیسے اُن دونوں کے درمیان کوئی دلچسپ راز مشترک ہو۔ اور وہ کافرادا بھی یُوں اُس کی طرف دیکھ کر مُسکراتی تھی، جیسے اُس نے اپنے لبوں کے پیٹے میں کسی نئی مُسکراہٹ کا ربن فٹ کیا ہو۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ ایک عورت اور ایک ٹائپ رائٹر میں کیا فرق ہے؟ ذرا گدگداؤ مُسکراہٹ باہر!

نہیں صاحب میں عورت کا دشمن نہیں ہوں، میں قنوطی بھی نہیں ہوں، میں عورتوں، ٹائپ رائٹروں، لیڈروں، وزیروں، سوشل ورکریوں اور جنتا سیوک سماج کا بے حد معترف ہوں۔ بس مجھے اگر کسی سے گلہ ہے تو اپنے مُلک کے جاہل عوام سے۔ میں کیا بتاؤں کہ کس قدر کوڑھ مغز ہیں یہ لوگ۔ اپنا بھلا بُرا سمجھنے کی توفیق بھی نہیں رکھتے۔ آپ خود ہی سوچئے، وزیر الگورام نے جو زرعی بل اسمبلی میں پیش کیا تھا، وہ کس قدر انقلابی ذہنیت کا حامل تھا۔ اگر وہ پاس ہو جاتا تو اُس سے ہمارے مُلک کے عوام کو کتنا فائدہ پہنچتا۔ اور باہر کے مُلک بھی اِس بل کے پاس

ہونے سے کس قدر خوش ہوتے۔ مگر جانے کیا بات ہوئی کسی کا دھیان ہی نہیں گیا اُس طرف۔ حالانکہ وزیرِ زراعت نے بہت عمدہ بِل پیش کیا تھا۔ اور اُن کی زرعی اصلاحات کا سارا مقصد یہ تھا کہ زمین کسانوں سے لے لی جائے۔ اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے! آپ کو سُن کر تعجب کیوں ہو رہا ہے۔ بالکل یہی مقصد تھا ——— اُس زرعی بل کا۔ یعنی زمین کسانوں سے لے لی جائے اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے..... !! میں اِسی سِلسلے میں وزیرِ زراعت سے انٹرویو لینے گیا تھا۔ گو بات مجھے بھی ذراسی عجیب لگی تھی کہ اِس زمانے میں جب چاروں طرف سے یہ آواز اُٹھ رہی ہے کہ زمین زمینداروں سے لیکر کسانوں میں بانٹ دی جائے۔ اُس وقت ایک مَن چلا ایسا اُٹھتا ہے جو بانگِ دہل ——— بانگ دہل آپ سمجھتے ہیں نا؟ نہیں، تو گھر جاکے ڈکشنری دیکھئے گا ——— جو بانگ دہل اسمبلی میں یہ بِل پیش کرتا ہے کہ زمین زمینداروں سے نہیں بلکہ کسانوں سے لے لی جائے اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے۔ اِس سِلسلے میں جب میں نے وزیرِ زراعت الگو رام رائے تربا ٹھی سے استفسار کیا تو اُس نے مجھے ایسا شافی جواب دیا کہ طبیعت پر آج تک اُس کا اثر باقی ہے۔

الگو رام نے کہا دیکھئے۔ یہ بات کس قدر غلط ہے کہ پہلے تو ہم زمین زمینداروں سے لیتے ہیں اور اس طرح شرفا کے ایک طبقے کو ختم کرتے ہیں۔ یہ طبقاتی نفرت ہمارے سرکاری دستور کے بالکل خلاف ہے۔ پھر ہم اس پر بس نہیں کرتے۔ ہم یہ زمین زمینداروں سے لیکر اُس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کسانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ زمین کے یہ ٹکڑے کر کے کسانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ زمین کی یہ ٹکڑے سازی ہماری زرعی پیداوار کو اور بھی کم کرا دیتی ہے۔ اور اس کے بعد جب ہمیں اس کا احساس ہونے لگتا ہے، تو ہم کوآپریٹو تحریک چلاتے ہیں۔ یعنی اُس زمین کو جو مختلف کسانوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹی گئی تھی پھر سے اکٹھا کرتے ہیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ بھئی ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھر سے اکٹھا کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ زمین زمینداروں کے پاس رہے۔ زمینداری جو ہے وہ گویا ایک طرح کا کوآپریٹو سسٹم ہی تو ہے۔ میرے موضع دھال پور ہی کو لے لیجئے۔ یہ ہمارا جدی پشتینی گاؤں ہے۔ لیکن ہمارے موضع کے سارے کسان اس میں ہل کے ہل چلاتے ہیں! ہل کے بیج بوتے ہیں! فصل اُگاتے ہیں! فصل کاٹتے ہیں۔ یہ کوآپریٹو تحریک نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ میرے والد خود اپنی آنکھوں کے سامنے سب کام کراتے تھے اور جو

بدمعاش کسان چون وچرا کرتا تھا، اُسے فوراً بے دخل کر دیتے تھے۔ آجکل عجیب حالت ہے کِسان کتنا نِکما، پھسڈی، کاہل اور کام چُور کیوں نہ ہو۔ کوئی اُسے اُس کی زمین سے بے دخل نہیں کرسکتا ہے۔ حالانکہ میرے ایسے اعلیٰ پوزیشن کے وزیر سے روز جواب طلبی ہوتی رہتی ہے۔ تم نے اپنے بھائی کو فلاں جگہ پر کیوں تعینات کر دیا۔ اور اپنے فلاں بھتیجے کو فلاں پوسٹ کیوں دیدی۔ ایک وزیر کو کسی وقت بھی اُس کی وزارت سے بے دخل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک معمولی جاہل، اَن پڑھ، مذہبی توہمات اور اندھے اعتقادات کے مارے ہوئے کسان کو کبھی اُس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔۔ یہ کوئی انصاف ہے؟

پھر دیکھئے جب سے زمینداروں سے زمین چھینی جارہی ہے۔ زرعی پیداوار کم ہوتی جارہی ہے۔ کسان پہلے سے زیادہ نکمّے اور کاہل ہوگئے ہیں۔ کیونکہ اب اُن کے سر پر زمیندار کا ڈنڈا نہیں ہے۔ نہ صرف زرعی پیداوار کم ہوگئی ہے بلکہ اناج کی قیمتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ ایمان کی بات کہئے دھرم کی بات کہئے ذرا پچیس تیس برس بلکہ چالیس برس پہلے کے زمانے میں جائیے۔ جبکہ کسانوں کی یہ غلط تحریک ہمارے ملک میں نہ چلی تھی۔ دیکھئے اُس وقت بھی زمین زمینداروں کے پاس تھی۔

لیکن ہمارا ملک کس قدر خوشحال تھا۔ ہمارے کسان کس قدر مزے سے رہتے تھے۔ اناج کس کثرت سے پیدا ہوتا تھا۔ اور کتنا سستا بکتا تھا۔ چاول روپے کا سولہ سیر تو میں نے لے کے کھایا ہے۔ گندم روپے کی تیس سیر آتی تھی۔ مکئی روپے کی سوا من بکتی تھی، تین آنے سیر دودھ تھا۔ گھی روپے کا چھ سیر بکتا تھا۔ آٹا روپے کا پندرہ سیر مل جاتا تھا، آجکل آٹا تو کیا لکڑی کا برادہ اِس بھاؤ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ اجی لکڑی کا برادہ تو کیا اگر آپ اپنے مکان کی تعمیر کے لئے باہر سے ریت لانے جائیں تو وہ اِس بھاؤ پر نہیں مل سکتی۔ مجھے معلوم ہے میں آجکل ڈپلومیٹک اینکلیو نیو دہلی میں اپنی کوٹھی تعمیر کرا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ریت کس بھاؤ پر ملتی ہے۔ سیمنٹ تو خیر کوٹا سے مل جاتا ہے۔ گورنمنٹ اگر ریت کا بھی کوٹا کر دے تو ممکن ہے کچھ بات بنے، مگر مرکزی حکومت کو اِس کی فکر کیا ہے۔ کلچر کے لئے وزارت الگ بنا دی ہے۔ یہ کلچر وکلچر سب بکواس ہے۔ میرے خیال میں تو مرکز کو جلد سے جلد ریت کی وزارت کھول دینی چاہئے۔ کب سے میری کوٹھی کا کام ریت کے نہ ہونے سے رُکا پڑا ہے۔

تو اِس لئے رپورٹر صاحب الگو رام رائے تر پاٹھی دھمال پوری وزیر زراعت اور جیل خانہ و پٹہ خانہ نے میری طرف اپنی کرنجی آنکھیں گھما کر کہا۔ اِس لئے میں یہ زرعی بِل آج اسمبلی میں پیش کر رہا ہوں تاکہ زمین

پھر سے زمینداروں کو مِل جائے اور مُلک میں اناج سستا مِلنے لگ جائے۔ اور ہمارے کسانوں کے لئے وہی خوشحالی کا دَور آجائے جو آج سے چالیس برس پہلے اِس مُلک میں تھا۔

"ہیر ہیر" میں نے پُرجوش انداز میں تالی بجائی۔ وزیر کی تقریر واقعی مدلّل اور نئے فکر کی حامل تھی۔ بعد ازاں اسمبلی میں جو اُس نے تقریر کی وہ اِس سے بھی بہتر تھی۔ مگر عین موقع پر جانے کیا ہوا کہ چیف منسٹر جس نے وزیرِ زراعت کو اِمداد کا یقین دلایا تھا عین وقت پر اُسی چیف منسٹر کا گروپ اپوزیشن سے مِل گیا اور یہ بِل پاس نہ ہو سکا چیف منسٹر کو دوبارہ وزارت کو تشکیل کرنا پڑی جس میں ابکے انھوں نے الگو رام ترپاٹھی کو نہ لیا۔ ترپاٹھی جی نے دِلّی میں آکے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے مرکزی حکومت سے ٹکر ہام لڑانے کی بہت سی کوششیں کر ڈالیں مگر کوئی مگر کوئی سعی بارور نہ ہوئی۔ اِس وزیر کا موضع دھمال پور بھی اِس سے چھن گیا۔ گویا یہ آدمی اپنی وزارت سے گیا، اور اپنے آبائی پیشے سے بھی گیا۔ اب آج آپ اِسے اِس ذلیل ڈھابے میں جلی ہوئی تندوری چپاتی کھاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں —— ایسے میں اگر کوئی غیر مُلکی سیّاح ہمارے سابق وزیر کو اِس حالت میں دیکھ لے تو ہماری خارجہ پالیسی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے؟

مگر اصل میں اُس وزیر کا جو قصّہ میں آپ کو سُنانے لگا تھا وہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ جی نہیں وہ سٹینو گرافر حسینہ کا قصّہ بھی اِس وقت نہیں سناؤں گا اُس کے لئے شام کا وقت بہتر ہو گا۔ جب بیئر کا سُنہری کف آلود سیال شفاف جام میں جھلکتا ہو، اور بہاں روشنیوں کا نور کسی کے سُنہرے بالوں پر دمکتا ہو اور کوئی آہو چشم دلنواز میری بغل میں بیٹھا ہو اور رِبل آپ ادا کر رہے ہوں۔ وہ قصّہ اِس وقت سُنانے کا نہیں ہے۔

اِس وقت تو میں آپ کو اِس وزیر کی دوسری ملاقات کا حال سُناتا ہوں۔ جب الگو رام اپنی وزارت سے برطرف کر دیا گیا اور دلی پہنچا اور کوشش کر کے بھی وزارت دوبارہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اُس نے نئی دلی میں وزیروں کا کلب کھول لیا۔ جی ہاں وزیروں کا کلب اِس نئی دلی میں۔ وہ جہاں آرنیا ہوٹل ہے نہ اُس کے بالکل سامنے کی بلڈنگ میں کھلا تھا۔ اُس کلب کی داستان بھی بے حد عجیب ہے۔ میں ابھی آپ کو سُناتا ہوں۔ ذرا میرے لئے آدھی پلیٹ مُرغ کی آرڈر کیجئے۔ مگر خیال رہے کہ اُس میں ایک ٹکڑا تو مرغ کی ٹانگ کا ہو، دوسرا ٹکڑا سینے کا ہو۔ مجھے مُرغ کی ٹانگ اور اُس کا سینہ بہت پسند ہے۔ کیا کہا آپ نے؟ مغرب میں عورت کو بھی اُسی معیار سے

پرکھا جاتا ہے۔ یعنی اُس کے پینے سے اور ٹانگ سے ؟۔ صاحب آپ نہایت عورت زدہ انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے یہ ہندوستان ہے، جس کا پڑوسی پاکستان ہے، جس کا پڑوسی افغانستان ہے۔ مغرب کی غلاظت یہاں نہ بکھیریئے۔ ہم لوگ ایک روحانی خطّے کے رہنے والے ہیں۔ مغرب کی مادّیت یہاں نہیں چلے گی جو مُرغ اور عورت کو ایک ہی معیار سے پرکھتی ہے —— چلیئے مُرغ نہ سہی ساگ والا گوشت ہی منگائیے۔

ہاں تو ایک روز میں اپنے اخبار کے دفتر میں بیٹھا ہوا پروف پڑھ رہا تھا کہ نائب مدیر نے ایک دعوتی رقعہ میرے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ کناٹ پلیس میں آج شام کے چھ بجے وزیروں کا کلب کھُل رہا ہے۔ آپ اُس کی رپورٹ لے آیئے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ یہ وزیروں کا کلب کیا بلا ہے۔ کارڈ دیکھا، واقعی آج وزیروں کے کلب کا اُدگھاٹن ہو رہا تھا۔ شری گدگدُ اچاریہ مرکزی وزارت کے سابق کامرس منسٹر اُس کا افتتاح کر رہے تھے۔ وزیروں کا کلب؟ —— بات اچنبھے کی تھی۔ لیکن جب میں نے کارڈ کے نیچے سکریٹری کا نام پڑھا تو چونک گیا۔ نیچے جلی حروف میں لکھا تھا آر۔ ایس، وی پی، سکریٹری الگو رام رائے ترپاٹھی، دھمال پوری، سابق وزیرِ زراعت اُتری دکھن پردیس

رئیس زادہ وجیل یافتہ (سترہ بار) ـــــ اُس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے اور افتتاح چھ بجے تھا۔ میں نے اُسی وقت سائیکل اُٹھایا اور وزیروں کے کلب میں پہنچ گیا۔

وزیروں کا کلب بہت عمدہ سجا ہوا تھا۔ پردے، گاؤ تکیے، تخت پوش، دیوان، صوفے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہینڈلوم انڈسٹری کی نمائش ہو رہی ہے۔ کاغذی پھولوں اور ربڑ کے رنگین غباروں سے سجے ہوئے مرکزی ہال کے ایک طرف نیرا بار تھا۔ جہاں صرف نیرا دستیاب ہوتی تھی۔ تمباکو نوشی کے کمرے میں صرف بیڑی پی جا سکتی تھی اور کھیلوں کے کمرے میں صرف شطرنج کھیلی جا سکتی تھی۔ الگو رام مجھ سے بڑے تپاک سے ملا، اب کے وہ وزیروں کا لباس یعنی اچکن اور چوڑی دار نہیں پہنے ہوئے تھا، بلکہ کھدّر کا ڈھیلا ڈھالا کُرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے سر پر گاندھی ٹوپی تو تھی لیکن اُس کا رنگ اب سُرخ تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا، "میں نے اپنی پارٹی سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اور اب سوشلسٹ پارٹی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اگر وہاں کامیاب نہ ہوا تو کمیونسٹ پارٹی میں جاؤں گا، اور اگر وہاں بھی کامیاب نہ ہوا تو اپنی پارٹی الگ بنا دوں گا!"

لیکن فی الحال تو میں نے وزیروں کا کلب کھول لیا ہے۔ جب مجھے وزارت سے الگ کیا گیا تو مجھے کوئی نہ کوئی کام تو ضرور کرنا تھا۔ اس لئے سوچ کے میں نے نئی دلّی میں وزیروں کا یہ کلب کھول دیا ہے۔ اس کا ہر وہ شخص ممبر ہو سکتا ہے جو کبھی مرکزی وزارت یا صوبائی وزارت میں وزیر، نائب وزیر، ڈپٹی نائب وزیر، یا ڈپٹی نائب جائنٹ وزیر رہ چکا ہو۔ مقصد اس کلب کا ہے سابق وزیروں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی بحالی۔ میں کہتا ہوں اگر ہماری حکومت شرنارتھیوں کی بحالی کے لئے ایک وزارت قائم کر سکتی ہے تو سابق وزیروں کی بحالی کے لئے بھی ایک الگ وزارت کیوں نہیں قائم کرتی؟

الگو رام نے زور سے میز پر مکا مار کر بڑی سختی سے انگریزی میں کہا۔

"There should be a separate ministry for the rehabilitation of ministers."

بے شک! بے شک!! میں نے سر ہلا کر پنسل سے اپنی نوٹ بک پر لکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری حمایت سے بے حد خوش ہوا۔ رازدارانہ لہجے میں میرے کوٹ کا بٹن پکڑ کے کہنے لگا ہمارے کلب کے تین سو ممبر بن چکے ہیں۔ اور آئندہ سال دو ڈھائی سو کے قریب اور ممبر بن جائیں گے۔

"اور اگر تم ______" میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"اِس کلب کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کردو اور ایگزیم انس میں تو کیسا لطف آئے؟

واہ واہ! تم نے کیا عمدہ بات سمجھائی ہے مجھے۔ الگورام نے میرے کوٹ کا بٹن توڑ کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔" پھر ہم سابق وزیروں کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس بلا سکتے ہیں پیرس میں ——— ارے سُنتے ہو پیرس میں؟"

پیرس کا ذکر آتے ہی الگورام رائے کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ چند لمحوں کے لئے چُپ رہا گویا دل ہی دِل میں پیرس کی انٹرنیشنل کانفرنس کے مزے لے رہا ہو۔ پھر یکایک اُسے کچھ یاد آیا اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اور جلدی جلدی کہنے لگا۔ اُدگھاٹن کا وقت ہو رہا ہے۔ شری گڈ گڈ آچاریہ آنے والے ہیں تم بھی چلو بڑے ہال میں!"

وہ مجھے چھوڑ کر جلدی سے بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہال میں جوق درجوق سابق وزیر داخل ہو رہے تھے۔ ہر صوبے، ہر نسل، ہر رنگ اور ہر قوم اور ہر زبان کے وزیر تھے۔ شمال کے وزیر اور جنوب کے وزیر، مشرق کے وزیر اور مغرب کے وزیر، دُبلے وزیر اور موٹے وزیر، لمبے وزیر اور چھوٹے وزیر، کالے وزیر اور گورے وزیر۔ گندمی وزیر اور سانولے وزیر،

صحت مند وزیر اور بیمار وزیر۔ وزیروں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔
جب سارا ہال سابق وزیروں سے بھر گیا تو الگو رام رائے ترپاٹھی نے
سکریٹری کی حیثیت سے اپنی رپورٹ پیش کی۔ وزیروں کے کلب کے
اغراض و مقاصد بیان کئے۔ جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اِسکے علاوہ
اُس نے حکومت کے کام پر بھی کڑی تنقید کی جو ہر وزیر، وزیر بننے سے
پہلے اور وزارت چھن جانے کے بعد کیا کرتا ہے۔ لیکن الگو رام رائے
کی تنقید تخریبی نہ تھی، تعمیری نہ تھی۔ مجھے اُس میں دو تین باتیں
بہت دلچسپ اور غور طلب معلوم ہوئیں، ایک اُس نے پنج سالہ
منصوبے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بتایا کہ مُلک کا اور غیر مُلکی زرِ تبادلہ
کا کروڑوں روپیہ فولاد کے کارخانے ڈھالنے میں برباد کیا جا رہا
ہے۔ حالانکہ ہم بڑی آسانی سے خام لوہا نکال کے باہر کے مُلکوں کو
بیچ کر وہاں سے ڈھلا ڈھلایا فولاد حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اُس
فولاد کی مشینیں بنا سکتے ہیں۔ اِس طرح سے ہم اُس کروڑوں
بلکہ اربوں روپے کی رقم کو بچا سکتے ہیں جو یہاں فولاد کے
مختلف کارخانے قائم کرنے کے سِلسلے میں برباد کی جا رہی ہے۔
زرعی سُدھار کے سِلسلے میں بھی اُس نے بے حد دلچسپ
بات کہی۔ زرعی بِل کے ناکام ہو جانے کے بعد الگو رام رائے نے

بھی ایک زیرک آدمی کی طرح اپنا عقیدہ بدل دیا تھا۔ اب وہ نہ یہ چاہتا تھا کہ زمین کسانوں میں بانٹ دی جائے نہ یہ چاہتا تھا کہ زمین زمینداروں میں بانٹ دی جائے۔ اب وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کسان زمینداروں میں بانٹ دیے جائیں !!

میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُفوہ! کس قدر انوکھا اور اچھوتا خیال ہے زرعی انقلاب کا۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایسے وزیر کو معزول کر دیا گیا ہے۔ لیکن جھگڑنے کی کوئی بات نہیں، حکومت کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گا اور وہ اسے پھر وزیر بننے کا موقع دے گی۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سارا ہال تالیوں سے گُونج گیا۔ معلوم ہوا الگو رام رائے کی تقریر ختم ہو چکی تھی اور اب سکریٹری کے اصرار پر شری گدگد آچاریہ اسٹیج پر اس کلب کا اُدگھاٹن کرنے کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ شری گدگد کو دیکھ کر نہ معلوم میرے ذہن میں کیوں ہُدہُد یا کلنگ کی صورت اُجاگر ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ اِن دونوں جانوروں کا دُور دُور تک ایسے دانشمند انسان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شری گدگد آچاریہ نے اسٹیج پر آکر دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کیا۔ اپنی دھوتی کا سِرا ٹھیک کیا۔

اپنے داہنے ہاتھ کو ایک خطرناک تہدیدی انداز میں فضا میں گھما کے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین"!

وہ مزید کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ کلب کا ایک چپراسی (جو اپنے اچھے زمانے میں اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتا تھا، یعنی جب اُس کا چچا وزیر ہوا کرتا تھا) دوڑا دوڑا ڈائس پر آیا۔ اور جلدی سے اُس نے کاغذ کا ایک پُرزہ شری گُدگُد آچاریہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس کا سانس پھُولا ہوا تھا اور وہ بے حد گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

شری گُدگُد آچاریہ نے بڑے اطمینان سے اپنی عینک کو ناک پر سرکاتے ہوئے اُس کاغذ کے پُرزے کو دیکھا۔ پھر مُسکرا کر بولے۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین"۔

پیشتر اس کے کہ میں اپنی تقریر شروع کروں ایک ضروری اعلان ہے، اُسے سُن لیجئے۔ مرکزی وزارت میں بڑی اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ مختلف محکموں میں ردّوبدل کے بعد اس بات کا بھی گمان ہے کہ مُکھیہ منتری مرکزی وزارت میں ایک نئے وزیر کو شامل کریں گے۔ آج سات بجے مُکھیہ منتری کی کوٹھی پر ــــــــــــ"

لیکن اِس سے آگے کسی نے شری گُدگُد آچاریہ کے اعلان کو نہ سُنا۔ تمام سابق وزیر اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مرکزی ہال کے دروازے کی طرف یلغار کرنے لگے۔ وہ ایکدوسرے پر پلے پڑتے تھے۔ ہر وزیر یہ چاہتا تھا کہ وہ سب سے پہلے ہال سے باہر نِکل جائے۔ دھکم دھکا۔ دھینگا مشتی کا وہ عالم تھا کہ مچھلی مارکیٹ کا نظارا دکھائی دیتا تھا۔ کئی موٹے موٹے توندیل وزیر پاؤں تلے آکے رَوندے جاچکے تھے اور زمین پر پڑے چلّا رہے تھے اور رحم کی التجا کر رہے تھے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین"! دو تین بار شری گُدگُد رائے آچاریہ نے چلّا کے کہا۔ پھر یکایک اُنھیں بھی کچھ یاد آیا، اور وہ بھی ڈائس پر اپنی تقریر کا مسودہ پھینک کر ایک اتنی لمبی چھلانگ لگا کر جو اِس عمر کے آدمی کے لئے تقریبًا ناممکن تھی ہال کے دروازے پر پہنچ گئے اور تیر کی طرح تمام وزیروں کے بیچ سے نِکل گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا وزیروں کے کلب میں سناٹا تھا۔ کُرسیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ صوفے اوندھے تھے۔ دو تین وزیر فرشِ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ اور ہسپتال کی ایمبولنس کا انتظار کر رہے تھے اور کلب کے باہر سڑک پر وزیروں کا جمِ غفیر

تھا۔ جو دونوں ہاتھ زور سے جھلاتے ہوئے وزیر اعظم کی کوٹھی
کی طرف دوڑ رہا تھا۔

لیجئے۔ ساگ والا گوشت بھی ختم ہو گیا۔ اور آپ کے عقب
میں بیٹھا ہوا الگو رام رائے بھی کھانا کھا کے چلا گیا۔ خیر اِس کی
بات تو ختم ہی تھی۔ اور یہ کم بخت اِس وقت یہاں ڈھابے میں
آگیا تو مجھے اِس کا واقعہ یاد آگیا۔ ورنہ وہ واقعہ جو میں آپکو
سُنانے والا تھا . . . وہ دوسرا ہی ہے۔ اور بہت اہم ہے۔
ایک روز کا ذکر ہے میں تپتی دوپہر میں اِسی ڈھابے کی ٹین کی
چھت کے نیچے بیٹھا ہوا ــــــــ آئیں آپ کدھر چلے؟
ــــــــ ارے بِل تو دیتے جائیے؟؟

جوگی

شہر سے ڈھوری گاؤں جاتے ہوئے راستے میں جوگی کی کُٹیا پڑتی ہے۔ ڈھوری گاؤں ہمارے شہر سے تین میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ وہاں تک شہر سے ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک بس جاتی ہے کیونکہ شہر سے ڈھوری گاؤں تک سمندر کے کنارے کنارے شہر کے امیر لوگوں نے سیر و تفریح کے لئے عمدہ بنگلے تعمیر کئے ہیں۔ جہاں پر نہایت ہی اعلیٰ اور مہنگی قسم کی عیّاشی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب سے شہر میں شراب بند ہوئی ہے۔ ڈھوری گاؤں میں ناجائز شراب کا دھندہ بہت چمک اُٹھا ہے، امیر آدمی تو خیر کسی نہ کسی طریقے سے شہر ہی میں وہسکی کا پرمٹ مُہیّا کر لیتے ہیں لیکن عام لوگوں کے لئے ڈھوری گاؤں کا ٹھرا ہی مُمکن ہے۔ چھ آنے میں نوٹانک شراب پی کر اور اُوپر سے ایک آنے کا گاٹھیا کھا کر غریب آدمی دِن بھر کے دھکّے بھول جاتا ہے۔ اِس لئے اِن دِنوں ڈھوری گاؤں کے مچھیرے بہت خوشحال ہو گئے ہیں۔ اِس سے پہلے بھی وہ لوگ خوشحال تھے۔ مگر اب تو اُنھیں ایک اور بزنس مِل گیا ہے۔ وہ دِن کو مچھلی پکڑتے ہیں۔ رات کو شراب بیچتے ہیں۔ عورتیں سونے میں لدی ہیں۔ مرد مِلک کی قمیص پہنے

گھومتے ہیں۔ بچے انگریزی سکول میں جانے لگے ہیں۔ دھوری گاؤں میں اتنی عمدہ کاٹیج انڈسٹری کا اضافہ ہوا ہے۔ جس کا پنج سالہ منصوبے میں کہیں ذکر نہیں ہے!

دھوری گاؤں جاتے ہوئے بس میں بیٹھا ہوا، میں یہی سوچ رہا تھا۔ آج میری جیب میں نوٹانک کے پیسے بھی نہ تھے۔ لیکن ہاں کبھی کبھار میری زندگی میں ایسے بھی دن آئے ہیں جب میں دھوری گاؤں سے ڈیڑھ روپے میں آدھی بوتل خرید کر وہیں جھونپڑی کے سامنے بیٹھ کر پینے لگتا تھا۔ مچھیرا ایلومینیم کی ایک گندی سی پلیٹ میں میرے سامنے مچھلی کے دو تین تلے ہوئے ٹکڑے رکھ دیتا، اور میں نہایت اطمینان سے جام سپ کرتا ہوا سامنے سمندر کی طرف دیکھنے لگتا۔ ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے یوں معلوم ہوتا گویا شراب ہونٹوں کو بوسہ دے رہی ہے۔ ہوائیں مہک سی جاتیں۔ چاندنی چھٹک سی جاتی اور دور تک پھیلے ہوئے سیاہ مچھلی جال سمندر کے کنارے کنارے بانس کی لمبی لمبی کھپچیوں سے بندھے ہوئے ہولے ہولے ہلنے لگتے۔ اور ان کے ہزاروں سوراخوں سے چاندنی کا نور بہتا ہوا دوسری طرف سمندر میں جا ملتا۔ مچھلی جال کے پس منظر میں کبھی کبھی کوئی مچھیرن بال کھولے مراٹھی ساڑھی کی لانگھ

لگائے کسی مچھیرے کے ساتھ سمندر پر نکل آتی۔ کبھی دو تین بچے خوشی سے
کلکاریاں مارتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گھومتے ہوئے
ساحل کی اوٹ میں چھپ جاتے۔ کبھی دس بارہ کولی قبیلے کے مچھیرے گیت
گاتے ہوئے اپنے شانوں پر کسی نئی کشتی کو پانی میں ڈالنے کے لئے نکل آتے۔
عورتیں گیت گاتیں۔ ناریل توڑے جاتے۔ سمندر میں تھوڑا سا دودھ ڈالا
جاتا۔ گڑ اور چیوڑا اور پھول اور پُر اسرار مقدس منتروں کے درمیان کشتی
سمندر میں ڈال دی جاتی۔ اور مچھیرے اُسے کھے کر کھلے سمندر کے گہرے
پانیوں میں لے جاتے جہاں ترسل اور جینا مچھلی افراط سے ملتی ہیں۔ یہ کشتی
کیا ہے جو ساحل سے بھی ملتی ہے۔ سمندر میں بھی جاتی ہے۔ سمندر بہت بڑا
ہے۔ اِنسان بہت چھوٹا ہے۔ مگر یہ کشتی جو انسان کی محنت کا، اُسکی جدوجہد
کا، اُسکی آرزو کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ کس جیداری سے سمندر کی سطح پر
ڈول رہی ہے۔ سمندر مسکراتا ہے تو یہ کشتی بھی کنول پھول کی طرح کھلی ہوئی
اُس کے سینے پر ہلکورے لیتی ہے۔ سمندر پھنکارتا ہے۔ قہر و قیامت کا نمونہ
بن جاتا ہے۔ تو بھی یہ کشتی اپنے بادبان تانے سینکڑوں فٹ اونچی لہروں کی
اوٹ میں کبھی اُوپر تو کبھی نیچے ہزار ترکیبوں سے اپنا پہلو بچاتی ہے۔ بدن
چُراتی ہے۔ اور طوفان کو چیر کر ساحل پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کبھی
کبھی کوئی کشتی بھی ڈوب جاتی ہے۔ کہیں پہ کوئی چیخ بلند ہوتی ہے۔ لہریں

مگرمچھ کی طرح اپنا خوفناک دہانہ کھولتی ہیں۔ اور کشتی قعرِ فنا میں غرق
ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ تو ایک کشتی کی بات ہے۔ اگر ایک کشتی ڈوبتی ہے تو
سینکڑوں سلامت رہتی ہیں۔ اور سمندر کے سینے پر اٹھلاتی رہتی ہیں۔
ہزاروں برس کی آویزش کے بعد کشتی نے سمندر کے ساتھ جینا سیکھ لیا
ہے۔ اور اب تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا عظیم سمندر نے بھی انسان کی
حقیر کشتی سے مفاہمت کر لی ہے۔ چاندنی رات میں جب سپید بادبان کھولے
ہوئے سُبک رفتار، سیم تن کشتیاں سمندر کے سینے پر تیرتی ہیں تو سمندر
ایک باپ کی طرح مسکراتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور ہر کشتی ہر لہر کا ثمر معلوم
ہوتی ہے۔

یہ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ جو انسان کے دل میں ہے
اور سمندر کی سطح پر ہے جام کے ہلکے ہلکے سکوروں کے درمیان مجھے محسوس
ہوتا تھا۔ لیکن آج اس وقت بس میں بیٹھے ہوئے مجھے یہ سب کچھ اجنبی سا
لگ رہا تھا۔ آج میری جیب میں نوٹانک تو کیا ایک چھٹانک شراب کے
بھی پیسے نہ تھے۔ آج میری جیب خالی تھی۔ اور پھر بھی اگر میں دھوری گاؤں
کی طرف جا رہا تھا تو شراب پینے کی غرض سے نہیں دھوری گاؤں کے
درگا مندر کے جوگی سے ملنے کے لئے جا رہا تھا۔

دھوری گاؤں کا دُرگا مندر بہت پُرانا ہے۔ اِتنا پُرانا تو نہ ہوگا جتنا کولیوں کا قبیلہ ہے۔ کیونکہ انسان پہلے آتا ہے اُس کے مندر مسجد اور گرجا بعد میں آتے ہیں۔ پھر بھی دُھوری گاؤں کا دُرگا مندر بہت پُرانا ہے اور گرد و نواح کے دیہات میں بہت مشہور ہے۔ اِس مندر کے پجاری کہتے ہیں کہ یہ مندر بہت پُرانا ہے۔ اور اِس کے اندر دیوار گیر تصویروں کا فن کہے دیتا ہے کہ یہ مندر بہت پُرانا ہے لیکن اِس کے اندر دُرگا ماتا کی مورتی جو شیر پر سوار ہے وہ زیادہ پُرانی نہیں دکھائی دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی زمانے میں یہ مندر کسی دوسرے دیوتا کا معبد تھا۔ پھر وہ دَور گزر گیا اور اُس دَور کے ساتھ اُس کا خُدا بھی چلا گیا۔ اور پھر دُرگا ماتا آگئیں، جن کی کولی قبیلے میں آج کل پُوجا ہوتی ہے۔ گذشتہ قرنہا قرن میں انسان نے کتنے ہی خُدا بدلے ہیں، اور جانے آگے کتنے خُدا بدلے گا۔ کون کہہ سکتا ہے؟۔

لیکن آج تو میں کسی خُدا سے بھی ملنے نہ جا رہا تھا۔ دراصل میں ایک معمولی ادیب ہوں۔ کسی اخبار میں کبھی کبھار کوئی مضمون چھپ جاتا ہے۔

تو آٹھ دس روپے اُس کے آجاتے ہیں۔ کوئی ایڈیٹر از راہِ التفات کوئی ایک آدھ افسانہ چھاپ لیتا ہے تو چار یا پانچ روپے وہاں سے بھی مِل جاتے ہیں۔ کبھی پچاس ساٹھ روپے ہوگئے تو دُھوری گاؤں جا کے نوٹانک پی لی۔ پچیس تیس ہوئے تو دال روٹی پر گذر کرلی۔ لیکن کبھی پچیس تیس بھی نہیں ہوتے۔ دس بارہ ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اِس مُلک میں جہاں ہر انسان کی محنت اور اُس کی آرزو کا صِلا ہے ایک ادیب کے لئے اپنے حُسنِ تخلیق کا مناسب صِلا طلب کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اِس لئے میں بھُوکوں مرتا ہوں۔ خوبصورتی کی تخلیق کرتا ہوں اور بھوکوں مرتا ہوں۔ کیوں اِس دُنیا میں مشین گن بنانے والے کو لاکھوں دئے جاتے ہیں اور ایک خوبصورت افسانہ لکھنے والے کو بھُوکا مارا جاتا ہے؟ کیوں ایک معمولی سنگترے کا رَس نچوڑنے والا آلہ ایجاد کرنے والے کو ہزاروں روپے دئے جاتے ہیں؟ اور زندگی کا رَس گھونٹنے والے شعر کے لئے ایک پیسہ مانگنا تجارت سمجھا جاتا ہے؟ کیوں ایک ادیب کو کسی دوسری کائنات سے آیا ہوا سیدِتنک سمجھا جاتا ہے؟ جو اپنے اندر لگی ہوئی بیٹری کے سہارے فضا میں چکر کاٹتا ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ اگر اُس کا تخیل کہکشاں تک پرواز کرتا ہے۔ اُس کے پاؤں بہرحال اِس زمین پر ٹکے ہوئے ہیں؟ —— یہ کس طرح کا اِنصاف ہے؟

میں ہر روز اِس طرح کی باتیں نہیں سوچتا لیکن آج میں بھوکا تھا۔ اور جیب میں ایک پیسہ نہ رکھتا تھا۔ اِس لئے مجھے بس بہت آہستہ چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ کنڈکٹر کا کھلا چرمی بٹوہ پیسوں سے کھنکھناتا ہوا قارون کا خزانہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سامنے بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی بس موٹے موٹے پستانوں والا دو ٹانگوں والا جانور معلوم ہوتی تھی۔ پیٹ کی بھوک خوبصورتی کا احساس تک مسخ کر ڈالتی ہے۔ اور روپے کو اُس کی حیثیت سے زیادہ، کہیں زیادہ اہمیت دینے لگتی ہے۔

دُھوری گاؤں کو آتے جاتے میں نے بس میں سے اکثر جوگی کی کُٹیا کو دیکھا تھا۔ ملنگ پیر کے قبرستان سے آگے جا کر ناریل کے درختوں کے درمیان ایک خوشنما ہری ہری گھاس کے قطعے کے بیچ میں جوگی کی کُٹیا تھی جس پر ناریل کے خشک پتّوں کی چھت تھی۔ اِس چھت کے اوپر کدّو، کریلے اور لوکی کی ہری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں قطعے سے سو گز کے فاصلے پر ایک اُونچے ٹیلے پر دُرگا ماتا کا مندر تھا۔ اِس جوگی سے پہلے یہ مندر سُنسان

اور ویران سا تھا۔ اِس کے کواڑ ہمیشہ کھلے رہتے۔ لوگ باگ آ کے منت مان جاتے، پھول، بتاشے، چاول، چیوڑے، گڑ اور ناریل کے ٹکڑے چڑھا جاتے۔ لیکن اِس مندر کی خبر گیری کرنے والا کوئی سادھو یہاں زیادہ دیر تک نہ ٹکتا۔ ممکن ہے اِس کی وجہ یہ ہو کہ اِس مندر پر رُوپے پیسے کا چڑھاوا بہت کم چڑھتا تھا۔ اور بھگوان تو خیر پھولوں ہی سے خوش ہو جاتے ہونگے لیکن بیچارے پُجاریوں کے زندہ رہنے کے لئے پھول کافی نہیں ہوتے۔ یا ممکن ہے وجہ یہ ہو جیسا کہ اِس گاؤں میں مشہور تھا کہ اِس مندر کو دُرگا ماتا کا شراپ تھا کہ یہاں کوئی جوگی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ گذشتہ دو تین جوگیوں کی پُراسرار موت کے بعد ماتا کے اِس شراپ پر لوگ بڑی سختی سے وشواس کرنے لگے تھے۔ لیکن گذشتہ چار سال سے ابتک ایک ہی جوگی اِس مندر کا پُجاری تھا۔ اُس نے آ کر مندر کی حالت ہی بدل دی تھی۔ یہ جوگی جنتر منتر ٹونے تعویذ سب کچھ دیتا تھا۔ بیماریوں کے علاج کے لئے اپنی دھونی کی بھسم دیتا تھا، اور ہر روز دُرگا ماتا کے سامنے دو گھنٹے بھجن گاتا تھا۔ اُس کی آواز بڑی سُریلی تھی۔ اُس کا رنگ گو کالا تھا لیکن اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نشیلی تھیں۔ وہ اپنے گلے میں مُنگے کے سُرخ پتھروں کا ایک کنٹھا پہنے ہوئے تھا۔ اور اُس کی پُوجا کی مالا بھی مُنگے کے پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ اور گو جوگی کا رنگ کالا تھا اور وہ متواتر چلّہ کشی سے دُبلا پتلا نظر آتا تھا۔ لیکن اُس کے

بال بے حد سیاہ اور گھنگھریالے تھے، اور شانوں پہ چھٹکے ہوئے تھے۔ جوگیوں کے
گیروا لباس میں وہ ایک پُر وقار اور پُر سکون شخصیت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔
شروع میں میں اُس کے سُریلے بھجن سے متاثر ہوا تھا۔ پھر مجھے اُسکی صاف ستھری
کٹیا بہت پسند آئی۔ پھر جب میں نے جوگی کو دیکھا تو اُس کے چلنے کا خاموش
متین انداز مجھے بہت پسند آیا۔ آجکل جہاں میں رہتا تھا وہ میرے ایک
دوست کا مکان تھا۔ میرا یہ دوست اب محکمہ پی ڈبلیو ڈی میں اوورسیر تھا۔
بچپن میں میرا ہم جماعت تھا۔ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا اگر تم اِس ذلیل افسانہ نویسی
کی طرف مائل نہ ہوتے تو اب تک میری طرح تمہاری شادی ہو چکی ہوتی۔ میری
طرح چار پانچ بچے ہوتے۔ میری طرح تمہارا اپنا مکان ہوتا۔ اور تمہاری طرح
میں دمہ کا مریض بھی ہوتا۔ میں نے اُس سے کہا۔ یہ باتیں میں برسوں سے سُن رہا
ہوں اور برسوں سے اِن باتوں کو سُن کر اَن سُنی کر دینے کا عادی ہو چکا ہوں۔
برسوں سے میں اپنے دوستوں رشتے داروں کے مکانوں میں رہتا آیا ہوں کیونکہ
میں تو ایک کمرہ تک کرائے پر نہیں لے سکتا۔ اگر بالفرض محال لے بھی لوں تو
ایک ہزار روپے کی پگڑی بلیک میں کہاں سے ادا کروں۔ اِس لئے میں نے
باری باری سے اپنے تمام رشتے داروں اور
دوستوں کے ہاں سال چھ ماہ رہ کر سترہ برس گذار دئے ہیں۔ لیکن آج وہ
دن آ گیا ہے کہ میرے ایسے تمام رشتے دار اور دوست ختم ہو چکے ہیں، جن کے

ہاں میں جا کے رہ سکتا تھا۔ آج آخری دوست نے یعنی اُس کمبخت اوورسیر نے بھی مجھے اپنے گھر میں جگہ دینے سے انکار کر دیا ہے اور مہینے بھر کے بعد مون سون شروع ہونے والی ہے، اس لئے مجھے ابھی سے اپنے رہنے کے لئے کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔

جب میں جوگی کی کُٹیا میں پہنچا تو وہاں چھ سات سوالی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی سب سے اخیر میں جا کر ڈنڈوت کر کے بیٹھ گیا، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کُٹیا کی دیواریں بانس کی کھپچیوں اور ناریل کے پتوں سے بنی ہوئی ایک دائرے کی صورت میں کھنچی ہوئی تھی، جس پر سبز سبز پتوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور اُن سے جو روشنی چھن کر آتی تھی وہ بھی سبز رنگ کی۔ اور اِسلئے آنکھوں کو بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ کُٹیا کے مرکز میں بانس کا ایک بڑا کھمبا تھا جو چھت تک جاتا تھا۔ جوگی اِس کھمبے سے ٹیک لگائے مِرگ چھالا پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے ناریل کا ایک چھوٹا سا کھنڈ دھیرے دھیرے جل رہا تھا۔

ایک موٹے توندیل خوفناک چہرے والے مچھیرے نے جو گلابی رنگ کی سِلک کی قمیص کے نیچے ایک لنگوٹ نما چار خانے والا رومال پہنے ہوئے

تھا، ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! دو دفعہ پولیس کی دھاڑ پڑ چکی ہے۔ یہ (موٹی سی گالی دے کر) انسپکٹر کا متھ میری جان کو آ گیا ہے۔ پچاس گیلن واش ایک دفعہ پکڑا۔ کاجو کی بارہ بوتلیں دوسری دفعہ پکڑ لے گیا۔ پانچ سو روپیہ جرمانہ اُوپر سے ہو گیا اس طرح تو جندہ رہنا مشکل ہے!"

جوگی نے بھسم دی۔ یعنی راکھ کی ایک چٹکی اپنے سامنے سے اُٹھائی اور موٹے مچھیرے کو دے دی۔ اور بولا "ماں کلیان کریں گی۔"

موٹا مچھیرا ڈنڈوت کر کے چلا گیا تو ایک اَدھیڑ عمر کی عورت جو اب بڑھاپے کی حدوں کو چھو رہی تھی آگے آئی اور ہاتھ جوڑ کے کانپتے ہوئے سُروں میں بولی "میں اکیلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"جوگی اِستری جاتی سے اکیلے میں بات نہیں کرتے!" جوگی نے تہدیدی انداز میں بتایا "بول مائی۔ سب کے سامنے بول!"

ادھیڑ عمر کی عورت نے سر جھکا لیا۔ آہستہ سے بولی "میرے تیرہ بچے ہیں، سب کے سب جندہ ہیں۔ گھر میں کھانے کو پورا نہیں پڑتا۔ مجھے اور بچہ نہیں چاہیے۔"

جوگی نے اُسے بھسم دی۔

اب اُس کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت کی باری تھی۔

"میرے بیاہ کو آٹھ سال ہو گئے ہیں. میرے بچہ نہیں ہوتا جوگی!"

عورت نے دونوں ہاتھوں سے جوگی کے پاؤں پکڑ لئے۔

جوگی نے اُسے بھی وہی بھسم دی۔

اُس کے بعد ایک بڑی خوبصورت لڑکی کی باری آئی۔ کولیوں میں ایسی خوبصورت لڑکی میں نے نہ دیکھی تھی۔ اُس کا رنگ سفید نہ تھا۔ گیہواں بھی نہ تھا۔ سانولے اور گیہواں رنگ کے بیچ میں تھا۔ ابرو کمان کی طرح خمیدہ، آنکھوں میں جوانی کی تیز اور تیکھی شرارت، چنچل ہونٹ رہ رہ کر ایک عجیب ادا سے خمیدہ ہو جاتے تھے۔ بال سیدھے چمکیلے اور گھنے اور کس کر ایک ایسے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے جس میں اُس لڑکی نے جوگی کے باغیچے کے آدھے سے زیادہ پھول لگا رکھے تھے۔ میں ہوتا تو اُس جوڑے میں سورج مکھی کا ایک ہی پھول لگاتا۔ لیکن میں ہوتا ہی کون تھا۔ اُس لڑکی کی ایک موٹی اور بھدی سہیلی بھی اُس کے ساتھ میں تھی۔ وہ اُسے ٹھوکا دے کر بھینس کی سی آواز میں بولی: "بول کنجن بول۔ جوگی سے بات کہہ دے۔"

وہ شرمیلے لب ایک عجیب ادا سے وا ہوئے۔ وہ خوشنما دانتوں کی فضا میں بجلی کی طرح کوند گئی۔ کنجن نے شرارت بھری نگاہوں سے جوگی کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں نہیں بتاتی۔ اگر یہ جوگی ہیں تو میرے دل کی بات خود ہی

سمجھ جائیں گے۔ جوگی کس بات کے ہوئے یہ اگر ایک کنواری کا سوال بھی نہ بوجھ سکیں ؟۔

کولیوں کی عورتیں بڑی دلیر اور ہمت والی ہوتی ہیں۔ وہ بچے جنتی ہیں۔ بچے پالتی ہیں۔ گھر دیکھتی ہیں۔ اپنے گھر والے کے ساتھ مچھلی پکڑتی ہیں۔ جال کے دھاگے بٹتی ہیں۔ سر پر ٹوکری اُٹھائے بازار میں مچھلی بیچتی ہیں۔ کوئی اُلٹی سیدھی بات کرے تو دو طمانچے دگا دیتی ہیں۔ شہروں میں جس قسم کے مرد پائے جاتے ہیں اُن سے جسمانی طاقت میں بھی یہ تگڑی ہوتی ہیں۔ بسوں میں چھُپ کر بس کنڈکٹر کے منع کرنے کے باوجود بیڑی پیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ٹانک پی کر شہری مردوں پر آوازے کسنے سے بھی باز نہیں آتیں! ——— لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود مجھے کنچن اُن سب سے زیادہ تیز اور طرّار معلوم ہوئی۔

جوگی کا سر نیچا ہو گیا۔ اُس نے اپنی چھند گلیا راکھ میں پھیری لیکن اُس نے کنچن کو بھسم نہیں دی۔ بولا۔ "اگر تم اپنے دل کی بات نہیں بتاؤ گی تو میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"چل تائی!" کنچن نے اپنی موٹی سہیلی سے کہا، اُس کے ہونٹ ایک عجیب پیاری نخوت سے مُڑ گئے۔ خوب صورت عورت کے غرور میں بھی ایک عجیب تمکنت ہوتی ہے۔ "اِس جوگی سے کچھ نہ ہوگا۔"

کنچن اور تائی دونوں اُٹھ کے چلی گئیں۔ اب کُٹیا خالی تھی۔

جوگی دیر تک راکھ میں دیکھتا رہا۔ پھر سر اُٹھا کر مجھے غور سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ اِن گولیوں کی طرح گنوار نہیں ہو۔"

میں چُپ رہا۔

"کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "جوگی میں دو دن سے بھوکا ہوں۔ یوں تو میں کئی صدیوں سے بھوکا ہوں۔ لیکن اب میرے ہر کسی نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ میرا جس پر جتنا حق تھا وہ سب میں لے چکا۔ حق تو میرا اب بھی سب پر باقی ہے لیکن دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔ اُدھر ڈاکٹر کا کہنا ہے اگر تم شہر میں رہے تو تمہارے پھیپھڑے گل جائیں گے۔ تم کسی پہاڑ پر چلے جاؤ۔ تمہیں کسی کھُلی اور اچھی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔"

جوگی نے ایک چُٹکی بھسم کی بھری۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا "میرا کسی دین، دھرم، عقیدہ، فلسفے پر اندھا بھروسہ نہیں رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے خدا پُوجے۔ لیکن جب اُن کا نور مجھ تک پہنچا تو ایک چھلنی کی طرح میری رُوح کے سوراخوں سے بہہ گیا۔ اس لئے ——— !"

"اِس لئے میری بھسم تمہارے لئے راکھ ہو چکی ہے؟" جوگی نے مُسکراتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں!"

"تو قصور روشنی کا نہیں ہے، تمہاری روح کی چھلنی کا ہے، جہاں اتنے سوراخ ہیں؟"

"جوگی۔ جہاں پر آج ایک سوراخ ہے، وہاں پر کبھی ایک زخم تھا۔ اور یہ سب زخم انسانوں نے مجھے دئے ہیں۔"

"تو پھر دُرگا ماں بھی تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔" جوگی نے بڑے افسوس سے کہا۔

"مگر تم تو کر سکتے ہو۔ مجھے اِس کُٹیا میں رکھ لو۔ مون سون سر پر آرہی ہے۔ رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ کھانے کے لئے بھوجن نہیں ہے۔ تمہارے مندر میں آجکل تو چڑھاوا چڑھ رہا ہے۔ پچھلے زمانے کے خوشحال مندروں میں درجنوں ودوان پنڈت، ادیب، کلاکار پناہ پاتے تھے، اور اپنا کام کرتے تھے۔ میں بھی ایک معمولی کہانی لکھنے والا ہوں مجھ پر اپنے مندر کے دوار کھول دو۔ اور پُرانے ہندوستان کی روایات کو تازہ کرو۔"

"تم کہانی کا بکھان کرتے ہو؟" جوگی نے خوش ہو کر پُوچھا۔

"ہاں۔"

"تو سُناؤ مجھے ایک کہانی۔ مجھے کہانیاں بچپن ہی سے بہت پسند ہیں۔ اِدھر باجو میں پاٹل صاحب رہتے ہیں۔ ریلوے میں انجینیئر ہیں۔ اُن کا نوکر میرے پاس آتا ہے۔ چرس پی کر بہت اچھے قصے سُناتا ہے۔"

"تب مجھے رکھ لو۔ میں تمہیں بہت اچھے قصے سنایا کروں گا، وہ انجنیئر کا نوکر کیا سنائے گا۔"

جوگی کا چہرہ خوشی سے منور ہو گیا۔ "سچ؟" اُس نے پھر پوچھا "سچ کہتے ہو؟ اور اگر کہیں جھوٹ بولتے ہو تو میں تمہیں دوسرے دن ہی یہاں سے چلتا کر دوں گا!"

"ایسا نہیں ہو گا جوگی۔"

"تو تم یہاں رہ سکتے ہو۔" جوگی نے مجھے اجازت دے دی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا۔ "تمہارا سامان کدھر ہے؟"

"سامان تو ایک سرے سے ہے ہی نہیں۔ ایک میرا تن کا چولا ہے۔ اُسکے اُوپر کپڑوں کا یہ چولا ہے۔ ایک ادیب کو اِس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔"

جوگی کی حیرت اور بڑھی۔ "پھر بھی کچھ تو ہو گا۔" اُس نے پھر پوچھا: "کوئی ٹرنک، کوئی بستر، لوٹا، انگوچھا؟"

"جوگی صاحب!" میں نے بڑے فخر سے جواب دیا۔ "میں ادیب ہوں تاجر نہیں ہوں"!!

جوگی کے ہاں رہتے ہوئے مجھے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ میں بڑے آرام سے تھا۔ کیلے کے پتوں پر مندر کا چڑھاوا کھاتا تھا، اور سمندر کی لہروں پر لکھتا تھا۔

اور تخیّل کے ریس کورس میں اپنے گھوڑے دوڑاتا تھا۔ میرے پھیپھڑے مضبوط ہو گئے تھے اور کھال چکنی ہوتی جارہی تھی۔ پہلے دو تین روز مجھے کہانی سُنانے کی تکلیف رہی۔ لیکن دو تین روز کے بعد جوگی نے میری کہانیاں سُننے سے انکار کر دیا۔ "اس کو تم کہانی کہتے ہو؟" وہ بھنّا کے بولا۔ "مجھے حیرت ہے۔ کوئی تمہیں اس کے پانچ روپے بھی کیسے دیدیتا ہے۔ مجھے دیکھو صبح سے شام تک مندر کی پُوجا کرتا ہوں۔ بھجن گاتا ہوں۔ چلّہ کرتا ہوں۔ مندر کی صفائی کرتا ہوں۔ گھنٹہ بجاتا ہوں بھسم دیتا ہوں۔ اتنی شدید محنت کے بعد کوئی مائی کالال بھول بتاشوں کے ساتھ پانچ پیسے دے جاتا ہے۔ ارے تم۔ لُوٹتے ہو لوگوں کو! یہ کہانی ہے؟ اسکو کہانی بولتے ہیں؟ ..... آؤ۔ میں تمہیں کہانی سُناؤں۔" اس کے بعد اُس نے مجھے پنچ تنتر میں سے کُتّے بِلّی، شیر بھیڑیے کی تمثیلی داستانیں سُنائیں۔ راجہ رانی کی بھی کہانیاں سُنائیں، جو بچپن میں ہم نے تم نے سب نے سُنی ہیں۔ جو آجکل بھی مدراس کی فلموں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ کہانیاں سُنا کے جوگی نے مجھے اِس طرح گھُور کے دیکھا جیسے میری دھوکہ بازی پر کچّا کھا جائیگا۔ اور مجھے اندیشہ ہوا کہیں جوگی مجھے اپنی کُٹیا سے نکال باہر نہ کرے۔ اس لئے میں نے سوچ سوچ کے طے کیا کہ جوگی کو الف لیلہ کی کہانیاں سُنانی چاہئیں۔ چنانچہ جس دن بلکہ جس رات میں نے اپنے جوگی کو الف لیلہ کی پہلی کہانی سُنائی

اُس کا دِل باغ باغ ہو گیا۔ اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میرا خشک کھردرا بدصورت کلّہ چوم لیا۔ اور کہہ دیا۔ "آج سے تم یہاں مستقل طور پر رہ سکتے ہو۔ چاہو تو زندگی بھر رہو۔ مگر ہر روز مجھے ایسی کہانی سنایا کرو۔" میں نے سوچا۔ میرا ابھی کیا جاتا ہے۔ میں بھی ہر شب محفل ہزار داستان سجاؤں گا اور اپنا سر قلم ہونے سے بچاؤں گا! چنانچہ اُس کے بعد میں ہر رات سونے سے پیشتر اُسے الف لیلہ کی ایک کہانی سُناتا رہا۔

جوگی دل کا بُرا نہ تھا۔ وہ عام سادھوؤں کی طرح کینہ پرور اور شہرت پسند فقیر بھی نہ تھا۔ معجزے دیکھنے یا دِکھانے کا وہ قائل نہ تھا۔ مذہب پر بھی اُس کا اعتقاد یونہی سا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہ تھا۔ لیکن جتنا کچھ وہ جانتا تھا اُسے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا عادی نہ تھا۔ دُرگا ماتا میں اُس کا اعتقاد ایک پُجاری کی طرح نہ تھا۔ وہ مندر کی دیوی سے ایسے سلوک کرتا تھا جیسے وہ خود اُس کا بیٹا ہو۔ اور ہر بات میں اپنا حق فائق سمجھتا ہو۔ دُرگا ماتا اُس کے لئے دیوی نہ تھی۔ ماں تھی۔ وہ اُس سے لڑتا تھا۔ اُس کے قدموں میں بچّوں کی طرح لوٹتا تھا۔ کبھی کبھی خفا ہو کے مندر سے چلا آتا اور تین تین دن مندر نہ جاتا۔ میں پوچھتا تو خفا ہو کے یوں جواب دیتا۔ "ماں سے لڑ لیا ہوں۔"

"کس بات پہ لڑ لئے؟" میں دلچسپی سے پوچھتا۔

"یونہی ایک بات پر تکرار ہو گئی تھی۔ ماں نے میرا سوال پورا نہیں کیا۔"

دوسرے دن میں اُسے پھر سمجھاتا۔

"آخر وہ تمہاری ماں ہے۔" میں کہنے لگتا۔

جوگی فوراً مجھے ٹوک کر کہتا۔ "تم بیچ میں مت بولو جی، ماں اور بیٹے کے اِس جھگڑے میں۔"

"دو دن ہو گئے ہیں۔ تمہیں مندر گئے ہوئے۔ آخر یہ کیا تک ہے۔ تم مندر نہیں جاتے ہو تو مجھے کھانا کہاں سے ملے گا۔"

"نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔ میں اب ماں کے دوار پر کبھی نہیں جاؤں گا۔" جوگی بچوں کی طرح ٹھنکتے ہوئے، اِتراتے ہوئے کہتا اور باہر چلا جاتا۔

اِن باتوں میں کوئی تصنّع نہ تھا۔ کسی کو فریب دینے کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ وہ واقعی اُس پتھر کی مورت سے لڑ لیا تھا۔ اور رُوٹھ جاتا تھا۔ اِن دنوں وہ بیحد مضطرب اور بے چین رہتا۔ آس پاس کے بنگلوں کے نوکر اِن دنوں اُسے چرس اور گانجا خوب پلاتے تھے۔ ناجائز شراب کشید کرنے والے کوئی بھی ہمارے لئے شراب لے کے آتے تھے۔ پہلے تو جوگی سب کو پھٹکار دیتا۔

"یہ جوگی کی کُٹیا ہے۔ یہاں چرس، گانجا، شراب سب منع ہے۔

خبردار اِدھر کوئی مت پیے۔ کان سے پکڑ کر نکال دوں گا۔"

چرس، اور گانجا پینے والے نوکر خوشامد سے جوگی کے پاؤں دبانے لگتے اور خوشامد سے کہنے لگتے۔

"نہیں جوگی مہاراج ہم بالکل چرس نہیں پیتے۔ ہم تو گانجے کو چھوتے تک نہیں۔ بس اگر حکم ہو تو ایک سگرٹ لگا لیں۔"

جوگی کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ سگریٹ میں چرس ملی ہوئی ہے۔ وہ کسی قدر ملول ہو کر کہتا۔ "اچھا ایک سگریٹ مجھے بھی دو۔ آج میرا جی بُرا ہو رہا ہے۔"

تھوڑی دیر میں چرس کا دَور چلنے لگتا۔ مجھے چرس اور گانجے سے بڑی نفرت تھی۔ اِس لئے میں اِن لوگوں کی ٹولی میں کبھی شامل نہیں ہوا۔ صرف جوگی کے ساتھ کبھی کبھار بیٹھ کے ٹھرّا پی لیتا تھا۔ وہ بھی جب وہ خود مجھے بُلا کے پلاتا تھا۔ مگر وہ بھی میری کمزوری جان چکا تھا۔ جس دن کوئی بھگت اُسے ٹھرّے کی بوتل دے جاتا وہ مجھے ضرور اپنے ساتھ پلانے پر اصرار کرتا۔

پی کر میں اُس سے پوچھتا۔ "تم ماں سے کیوں لڑے"!

"ایسے ہی! اُس نے میرا ایک سوال پورا نہیں کیا تھا۔"

"کون سا سوال؟"

"بھگیرو مانجھی کا لڑکا تھا۔ چار سال کے بعد ایک ہی تو لڑکا ہوا تھا اُس غریب کے گھر۔ میں نے منتر دیا۔ اچھّا نہیں ہوا۔ بھسم دیا اچھّا نہیں ہوا۔ ماں سے کہا۔ ماں نے میری بات نہیں سُنی۔ لڑکا مر گیا۔ میری بڑی بے عزّتی ہوئی۔ ماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

"ماں نے اگر ایسا کیا بھی تو اُس میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ دیوی دیوتاؤں کی باتیں ہیں۔ تم اِن جھمیلوں میں کیوں پڑتے ہو۔ آرام سے پُجاری بن کر زندگی بسر کرو۔"

جوگی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "وہ بچّہ بڑا خوبصورت تھا۔ جب بھگیرو مانجھی کی بیوی نے اُسے میری گود میں دیا تو میں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میری ماں ——— میری ماں ڈائن کیسے ہو سکتی ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا!"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "تم کس کے پیچھے پڑے ہو۔ وہ تو پتھر کی عورت ہے۔" مگر جوگی سے کچھ نہ کہا۔ اِس کُفر کو وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اِس لئے میں نے سر جھکا لیا۔ اور خاموش رہا۔

ساون سون کے دِن قریب آ رہے تھے۔ ہواؤں میں نمک اور نمی کی مقدار بڑھ گئی۔ جسم پر پسینہ بہت دیر میں سُوکھنے لگا۔ کُھلے نیلے آسمان میں

سپید بادلوں کے سپید بادبان کھُلتے جا رہے تھے۔

"اِن کشتیوں کے کون مچھیرے؟ کس مچھلی کے گاہک

سُندر سُندر بادل گھومیں ناحق ناحق!!"

میں نے مُڑ کر دیکھا کنچن یہ گیت گاتی ہوئی پگ پگ پر ایک عجیب ادا سے ڈولتی کمر لچکاتی اُوپر ٹیلے سے نیچے جوگی کی کُٹیا کو آرہی تھی۔ ساتھ اُس کی وہ موٹی بھدّی سہیلی تانی تھی۔ کنچن کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا تھال تھا۔ اُس نے نوگزی سبز رنگ کی مراٹھی ساڑی پہن رکھی تھی۔ سبز رنگ کے ریشمی کھن کا بلاوز تھا۔ ایسے دلربا انداز میں ٹیلے سے نیچے اُتر رہی تھی۔ گویا کسی کے دل میں اُترتی جا رہی ہو۔ جوگی بھی میرے ساتھ کُٹیا کے دروازے پر کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لمحے وہ کُٹیا کے اندر چلا گیا۔ کنچن نے میری طرف دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا ہے۔ جُوں ہی کوئی خوبصورت لڑکی میری طرف دیکھتی ہے۔ میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ بس اِس سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ سترہ سال ہو گئے!

کنچن نے مجھ پر بھرپُور دوا کرنے کے بعد مجھے گویا ایک کیڑے کی طرح ٹھوکر لگا کر الگ کر دیا۔ بولی۔

"وہ ماں کا لاڑلا بیٹا اندر ہے؟"

میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ کیا کرتا۔ بات کرنے کی ہمت ہی

نہ تھی۔ دو سو افسانے اِن لڑکیوں کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ آج تک یہی معلوم ہوا کہ لڑکی سے بات کیسے کی جاتی ہے۔ اِس پر بھی اگر لوگ میرے افسانے پڑھ لیتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اُن بیچاروں کی زندگی مجھ سے کہاں مختلف ہے۔ وہ بھی تو بس میری طرح دل ہی دل میں للچاتے رہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ لیتے ہیں اور للچاتے رہتے ہیں۔ میں کیا جانتا نہیں ہوں۔ اُدھر عورتیں بھی کہ جب مرد اُن سے باتیں نہیں کرتے تو وہ الگ بیٹھ کر کُڑھتی ہیں۔ بلاشبہ کُڑھتی ہونگی۔ آخر اِس کنگھی چوٹی سُرخی پاؤڈر کا کیا مطلب ہے؟ محض آئینے کو رِجھانے سے کیا فائدہ۔ جب کوئی مرد بڑا بات نہ کرے۔ دونوں طرف ایسی ذہنی ناآسودگی ہی میں تو میرے پانچ روپے والے افسانے بِک جاتے ہیں۔

ورنہ ———— !

کنچن اندر چلی گئی۔ جوگی چُپ چاپ دُھونی رمائے بیٹھا رہا۔ کنچن نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ بڑی دلیری سے بولی۔

"مجھے بھسم دو!"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"پہلے اپنا مدعا بیان کرو۔"

کنچن نے پھر بڑی بے خوفی سے جوگی کی آنکھوں میں دیکھا۔ بولی۔
"میرا مدعا وہی ہے جو تمہارے دل میں ہے!"
جوگی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ بولا۔
"اگر تمہارا مدعا وہی ہے جو میرے دل نے سمجھا ہے تو وہ ضرور پورا ہو گا!"
کنچن کی نظریں جھک گئیں۔ اُس نے نہایت نرم اور کمزور لہجے میں کہا۔ "تو پھر مجھے بھسم دو جوگی!"
کنچن نے جوگی کے پاؤں کو ہاتھ لگایا۔ جوگی نے اُسے بھسم دی۔ اِس کے بعد کنچن نگاہیں اُونچی نہ کر سکی۔ وہ اُلٹے پاؤں دھیرے دھیرے کُٹیا سے باہر نکل گئی۔

رات کو سونے کے وقت جب میں الف لیلہ کا مشہور قصہ پیر تسمہ پا کا جوگی کو سُنانے لگا تو اُس نے مجھے ہاتھ کے اِشارے سے روک کر کہا۔
"مت سُناؤ جی۔ آج جی اچھا نہیں ہے۔"
"چرس منگاؤں۔"
"نہیں"!
"رام بھروسے سے گانجا لاؤں؟"
"نہیں!"

"شراب پیوگے؟"

"نہیں! نہیں!!" جوگی نے بڑی سختی سے کہا۔ اُس نے زمین پر لیٹ کر اپنی آنکھیں کُٹیا کی چھت پر گاڑ دیں۔ پھر ایک لمبے خاموش وقفے کے بعد بولا۔

"آج طوفان آنے والا ہے۔ میں مندر میں جا کے ماں کی اُپاسنا کرتا ہوں۔"

جوگی کُٹیا سے نکل کر چلا گیا۔ رات بھر وہ کُٹیا میں واپس نہیں آیا۔ وہیں مندر میں پُوجا کرتا رہا ہو گا۔ لیکن جب صبح ہوئی اور طوفان پھر بھی نہ آیا تو میں نے جوگی سے طنزاً کہا۔

"وہ رات والا طوفان کیوں نہیں آیا؟"

"طوفان تو آیا تھا" جوگی نے دھیرے سے کہا۔ پھر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے لکڑی کے کھمبے سے منگل کے منکوں کی مالا چالیس خوفناک چلّوں سے سادھی ہوئی مالا اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور آنکھیں بند کر کے جاپ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دن بھر وہ جاپ کرتا رہا۔ شام کو جب وہ جاپ سے فارغ ہوا۔ تو بیحد مسرور دکھائی دیتا تھا۔ کہنے لگا

"سمندر پر چلتے ہو۔ آج اتوار ہے۔ آج تو بہت رونق ہو گی۔"

"جوگیوں کو رونق سے کیا؟ تم نے تو دنیا تج دی ہے!"

"میں نے تج دی ہے۔ دُنیا نے تو مجھے نہیں تجا۔ اور پھر میں جوگی ہوں۔ تم تو نہیں ہو۔ چلو اِس کُٹیا سے باہر نکلو۔"

ہم دونوں کُٹیا سے نکل کر شہر کی طرف ساحل ساحل ہو لئے۔ سمندر کے کنارے کنارے اونچے اونچے ٹیلوں پر شہر کے امیر لوگوں کے بنگلے تھے۔ بنگلوں سے اُتر کر ناریل کے نیم تاریک جھُنڈوں میں رنگا رنگ برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اِن جھُنڈوں کے اِدگرد بڑی بڑی لمبی امریکی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شہر سے مرد اور عورتوں کی ٹولیاں پک نِک منانے کے لئے اُن گاڑیوں میں آئی تھیں۔ اور اب اِن کاروں میں اپنا لباس اور اپنی تہذیب اُتار کر ناریل کے مختلف جھُنڈوں میں نیم عُریاں حالت میں دادِ نشاط دے رہی تھیں۔ یہاں پر پرمٹ کی وِھسکی کے دَور چلتے ہیں اور راکن رول موسیقی کی دُھن پر مضطرب رُوحیں ناچتی گاتی تالی دیتی چیختی چلاّتی نظر آتی ہیں۔ ہر شخص تو اُنہیں نہیں دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ناریل کے جھُنڈ بنگلے والوں کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں۔ یہاں پولیس بھی وارنٹ کے بغیر چھاپہ نہیں مار سکتی۔ ہاں کاروں کی اُوٹ میں سے جھُنڈوں کے تاریک سایوں میں جگنوؤں کی طرح جھلملاتی ہوئی نیم تاریک روشنیوں کی شطرنجی میں کبھی کبھی کسی ناچتی ہوئی نوجوان حسینہ کا گیرے دار

فراک ہوا میں مچھلی کے جال کی طرح اُڑتا ہوا دکھائی دے جاتا ہے۔ دوسرے لمحے میں وہ اُڑتا ہوا فراک اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔ اور ایک نسوانی چیخ تعجب اور ہنسی کی یوں بلند ہوتی ہے۔ جیسے مچھلی جال میں پھنس گئی ہو۔ مگر یہ بہت کم مردوں کو معلوم ہے۔ کہ مرد لوگ مچھیرے نہیں ہوتے۔ دراصل عورت مچھیرن ہے اور مرد مچھلیاں۔۔ مردوں کو بہت دیر میں پتہ چلتا ہے۔ مگر اُس وقت تک وہ جال میں پھنس چکے ہوتے ہیں۔ بے چارے!

لیکن یہ خوبصورت، خوشنما سُبک عیاشی، جہاں سرکاری اجازت نامے سے حاصل کی گئی وِھسکی بلوری جام میں پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمکتی ہے۔ جہاں منجمد پنڈلیوں کا شفاف بلور ہوس کی آنچ میں پگھل پگھل جاتا ہے۔ جہاں گفتگو میں فقرے ایسے خوبصورت، چمکیلے اور گھومے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ گویا کسی ادیب نے نہیں کسی حجام نے اِن کی نوک پلک سنوار کے اُس پر "پرم" کر دیا ہو۔ اِن فقروں پر ہاتھ پھیرئیے تو احساس ہوتا ہے گویا آپ کسی کی شفاف پنڈلی پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ یہ تمام عیاشی کے لوازمات صرف ناریل کے جھنڈوں تک محدود ہیں۔

ناریل کے جھنڈوں سے نیچے اُتریئے تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آپ عیاشی کے نچلے طبقے میں اُتر آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عیاشی کے

بھی طبقے ہوتے ہیں۔ یا کم سے کم سطحیں ضرور ہوتی ہونگی۔ ورنہ اتنا نمایاں تضاد ایک ہی جگہ پر کیسے نظر آتا؟ ناریل کے جھنڈوں سے اتر کر اگر کوئی دیکھے تو اُسے ساحل کے وسیع ریتلے میدان میں متوسط طبقے کے سیکڑوں لوگ اپنے بیوی بچوں سمیت دادِ عشرت دیتے دکھائی دیں گے۔ اِس طرح کہ کوئی اوندھے مُنہ لیٹا ہے اور مُٹھیوں میں ریت بھر بھر کر اپنے سر پر ڈال رہا ہے۔ ایک عورت اپنے سب سے چھوٹے بچّے کو دودھ کی بوتل پلا رہی ہے۔ دوسرا بچّہ اُس کے پستان سے جونک کی طرح چمٹا ہوا گویا دودھ کی دوسری بوتل پی رہا ہے۔ سب سے بڑا لڑکا ایک ہاتھ سے ماں کی ساڑی کا پلّو اور دوسرے ہاتھ سے اپنی قمیص اُٹھائے پیشاب کر رہا ہے۔ اور پیشاب کی دھار کو ریت میں غائب ہوتے دیکھ کر محوِ حیرت ہے! کالج کے دو لونڈے حریص نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بے تحاشا اور بے مطلب ہنستے ہوئے گزر رہے ہیں۔ دس بارہ لڑکیوں کا غول دیکھنے والوں کی نگاہوں سے جھجکتا۔ ہچکچاتا۔ شرماتا گزر رہا ہے۔ ہر لڑکی کس قدر خود شناس ہے۔ اپنی ہر حرکت اور ہر ادا پر نازاں۔ اپنے حُسن میں گُم۔ چلتا پھرتا آئینہ! کیوں مرد آئینے میں صرف اپنی بدصورتی دیکھتا ہے۔ اور عورت صرف اپنا حُسن تلاش کرتی ہے؟۔ اور وہ جو اس لڑکیوں کے گول کے قریب

اُلٹا کھڑا شیشں آسن کر رہا ہے وہ کیا دیکھ رہا ہے؟ لیکن کچھ لوگ سمندر کے کنارے آکر بھی کچھ نہیں دیکھتے۔ وہ ناریل کے جُھنڈ۔ ڈوبتی ہوئی شفق، ہلکورے لیتا ہوا سمندر، اپنی بیوی کے بالوں میں لگی ہوئی پھولوں کی چمپا وینی —— کچھ نہیں دیکھتے۔ اور ساری دنیا سے بے نیاز چاٹ کھانے میں لگے رہتے ہیں۔ ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ زبان سُوں سُوں کر رہی ہے۔ مگر وہ لوگ دہی بڑے کی چاٹ میں تیکھا مسالہ ڈلوا کے مزے سے کھائے چلے جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس پنشن یافتہ بُڈھے گنجے گدھوں کی طرح ایک نیم دائرے کی صورت میں بیٹھے ہیں۔ اور ایک سوئے بجلے مچھلی رنگ کے توندیل سے گیتا کا ساتواں ادھیائے سُن رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے عمر بھر رشوت کھائی ہے۔ چین سے پنشن پائی ہے۔ اپنے بچے بالے بیاہ لئے ہیں اور اب آخرت کے سفر کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں اور ہر سفر کے لئے زاد راہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اِس لئے یہ لوگ آنکھیں بند کئے گیتا کا پاٹھ سُن رہے ہیں۔ پاٹھ کیا سُن رہے ہیں اپنے دل کی غلیظ پوٹلی میں گرہ دیکر گیتا کے مقدس عرفان کو ایک باسی روٹی کی طرح باندھ لینا چاہتے ہیں۔ اِن لوگوں کے ڈھیلے ڈھالے رُخساروں میں سالہا سال کی بوسیدہ عیاریاں اور مکاریاں غلیظ پوٹلیوں کی صورت میں لٹکی ہوئی

ہیں۔ اِن لوگوں کے لئے نہ گلگوں شفق ہے نہ سانولے بادلوں کی ملاحت ہے نہ شوریدہ سر لہروں کی گھن گرج ہے۔ ان کے لئے ہر طوفان مر چکا اور ہر آرزو ختم ہو چکی۔ پھر یہ لوگ سمندر پر کیا کرنے آتے ہیں؟

یہاں پہنچ کر جوگی نے مجھ سے کہا۔ "چلو واپس چلو!"

"کیوں؟"

"میرا جی گھبرا رہا ہے۔"

"گیتا کا پاٹھ نہ سنو گے؟"

جوگی نے گھوم کر میری طرف دیکھا پھر منھ پھیر کر واپس دوڑنے لگا۔ اُسکی پُروقار چال کی ہر ادا ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک خوفزدہ جانور کی طرح اِس تماشہ گاہ سے دوڑ رہا تھا۔

چھ سات دن کے بعد کنچن پھر آئی لیکن اب کے اپنے ساتھ موٹی بھینس کو نہ لائی۔ اب اُس کے ساتھ ایک نوجوان مچھیرا تھا۔ ناٹا اور سیاہ۔ لیکن بے حد تنومند۔ وہ کھلے کالر والی نیلے رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اور قمیص کے نیچے وہی چار خانے والا رومال، چھوٹا سا رومال جو اُس کی رانوں کو بھی اچھی طرح سے نہ ڈھک سکتا تھا۔ اُس کے سیاہ

چمکتے ہوئے کسرتی بدن سے کچّی شراب کی مہک آتی تھی۔ گنجن اُسے ہاتھ سے کھینچ کر جوگی کے سامنے لے گئی اور اُسے دھکا مار کر جوگی کے پاؤں پر گرا دیا۔ بولی۔

"یہ ہیرا ہے میرا منگیتر۔ مجھ سے بہت شرماتا ہے!"

جوگی نے ہیرے کی طرف دیکھا۔ اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ پھر جوگی نے نظریں جھکا لیں۔ وہ خاموش چُپ چاپ دھُونی کے کنارے آسن پر بیٹھا رہا۔ ایسا کہ گنجن کو گمان ہوا کہ شاید جوگی سو گیا ہے۔ اس لئے وہ چلّا پڑی۔

"اِسے بھسم دو! اِسے بھسم دو!!"

"کاہے کے لئے؟" جوگی نے آنکھیں کھول کر کمزور آواز میں کہا۔

"جب جوگی ہو کر تم نے میرے دل کی پہلی بات بُوجھ لی تو دوسری بات کیوں نہیں بُوجھ سکتے؟"

جوگی نے سنجیدہ رُو ہو کر جواب دیا۔ "کوئی بڑے سے بڑا جوگی عورت کے دل کا بھید معلوم نہیں کر سکتا ہے۔"

اِس جواب میں سنجیدگی کے ساتھ ایک عجیب قسم کی حسرت تھی۔!

گنجن ہنس کر بولی۔ "مگر تم کوئی معمولی جوگی نہیں ہو۔ تم نے کیسے جان لیا کہ میں اسی لڑکے سے محبّت کرتی ہوں۔ میں نے اِس کا نام تمہارے سامنے نہیں لیا۔ کیونکہ میں اِس سے محبّت کرتی تھی لیکن یہ مجھ سے محبّت نہیں کرتا تھا

اِس لئے میں زندگی بھر اِس کا نام نہ لیتی تمہارے سامنے۔ یا کسی کے سامنے! مگر تم نے تو خود ہی مالُوم کر لیا اور مالُوم کر کے مجھے بھسم دی۔ اُس کے کھانے کے بعد جب اِس سے مِلی ہُوں یہ ــــ یہ ــــ ہیرا ــــ اب مجھ سے پیار کرنے لگا ہے۔ جوگی! ــــ اِس لئے۔ جوگی اب تم دوسری بات بھی بُوجھ جاؤ! اور اِسے بھسم عطا کر دو! تا کہ ہم دونوں کے دل کی مُراد پُوری ہو۔"

کنچن نے بھسم لینے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھا دئے۔ اور کہنی سے ایک ٹھونکا ہیرا کی بغل میں دیا۔ ہیرا نے بھی دانت نکال دئے اور ہاتھ جوگی کے آگے بڑھا دئے۔

جُوگی دیر تک ناریل کے ٹھنڈ کو اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ اُس کے لب سختی سے اندر کو بِھنچے ہوئے تھے اور جب اُس نے دُھونی سے راکھ اُٹھا کر لڑکی اور لڑکے کے ہاتھوں میں رکھی، تو اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔

رات کو جب ہم سونے لگے تو اُس نے پُوچھا۔ "اُس جِن کی کہانی کس طرح ہے جو اپنے سر پر لکڑی کے ایک بڑے بکسے میں ایک لڑکی کو قید رکھتا تھا؟"

میں نے پوچھا "تمہیں کیا لکڑی کا ایک بڑا بکسا چاہیئے؟"

جوگی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بانس کے کھمبے سے منگل کی

اُتار لی۔ اور لکڑی کی کھڑاؤں پہن لیں۔ بولا۔ "آج کی رات بڑی بھیانک اور ڈراؤنی ہے۔ آج کی رات میں ماتا کے چرنوں میں رہوں گا۔"!

"مگر آج کی رات تو بڑی خوبصورت اور اُجیاری ہے۔ اِسے ڈراؤنی کون کہتا ہے؟"

جوگی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاندنی رات میں کُٹیا سے باہر نکل گیا اور ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ میں کُٹیا کے دروازے سے لگا اُسے ٹیلے کے اُوپر چلتا ہوا دیکھتا رہا۔ مندر کے دروازے بند تھے۔ جوگی نے ٹیلے کے اوپر چڑھ کر زور سے مندر کے کواڑ کھول ڈالے۔ اور پھر رات کے بارہ بجے میں نے دُرگا مندر کے گھنٹے کو زور زور سے بجتے اور فضا کو اُسکی کربناک وحشی صداؤں سے گونجتے سُنا۔ اور میرے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دَوڑ گئی۔ میں گھوم کر واپس کُٹیا میں آ گیا۔ جہاں جوگی کی مرگ چھالا خالی پڑی تھی۔ اور دُھونی سے ہلکا ہلکا سا دُھواں بلند ہو رہا تھا۔

اے ناریل کے ٹھنڈ تو کب تک جلے گا؟

سب بات طے ہو گئی۔ جوگی نے مجھے کُٹیا سے نکال دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بات بہت بڑی نہ تھی۔ بات بالکل معمولی تھی۔ میرا ایک کلاس فیلو

جو سکول میں بیحد غبی ہوا کرتا تھا۔ اِن دنوں شہر میں پولیس انسپکٹر کے عہدے پر تعینات تھا۔ اِن دنوں اُس کے حلقے میں دھوری گاؤں بھی شامل تھا۔ وہ ایک روز اِدھر ناجائز شراب کی تفتیش کرتا ہوا آ نکلا۔ اور مجھے سڑک پر مل گیا۔ میں نے اُسے اور اُس نے مجھے پہچان لیا۔ غبی آدمی پولیس انسپکٹر کیا وزیرِ اعظم بھی بن جائے تو بھی اپنی باتوں سے پہچانا جاتا ہے۔

اُس نے مجھ سے کہا: "تم جوگی کو اپنے ساتھ ملا لو۔ اور ہماری مخبری کرو۔ پیسے کی نکرمت کرو۔ میں تم دونوں کو مالا مال کر دوں گا۔ مگر ناجائز شراب کی بھٹیاں برآمد ہونی چاہئیں۔"

"مگر میں ادیب ہوں۔"

"ادیب ہو تو کیا ہوا۔ بھوکے نہیں مرتے ہو؟"

"آجکل تو نہیں مرتا۔ مندر سے دو وقت کھانا مل جاتا ہے۔"

"شرم نہیں آتی راجپوت ہو کر براہمنوں کی طرح بھکشا مانگتے ہو۔ یہ لو سَو روپے۔ اپنے پاس رکھو۔ اور جیسا میں کہتا جاؤں ویسے کرتے جاؤ۔ افسانہ نویسی میں کیا رکھا ہے۔"

سَو روپے؟ بیس افسانوں کے پیسے۔ ایک مخبری کے لیے؟ میں دَوڑا دَوڑا جوگی کے پاس گیا اور اُسے سارا حال کہہ سُنایا۔

"یہ لو سَو روپے جوگی۔ اور مخبری کرو۔ میں تو ایک غریب ادیب

ہوں۔ مجھ سے تو مخبری بھی نہ ہو گی۔ میں تو بیحد ڈرپوک آدمی ہوں۔"

جوگی نے کہا: "یہ سَو روپے میں نہیں لے سکتا۔ ماں مجھ سے خفا ہو نگی۔"

"کیوں خفا ہوں گی۔ سَو روپے کا چڑھاوا تو کبھی اِس مندر پر نہیں چڑھا۔ اور یہ کوئی گناہ کا کام بھی نہیں ہے۔ گناہگار کو پکڑا دینے میں تمہیں کوئی عُذر نہ ہونا چاہیے۔

جوگی نے کہا: "میں جوگی ہوں۔ میں مدعی اور ملزم دونوں کو جینے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو پست ہمت ہوں۔ محض اس وجہ سے اِس روپے کو نہیں لے رہا۔ مگر تم تو چالیس چلّے کاٹے ہوئے ہو! تمہیں کس کا ڈر ہے!"

مگر جوگی نے سو روپیہ نہ لیا۔ اُس نے رام بھروسے کے حوالے کر دیا۔ جو چرس پیتا تھا۔ اور ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ رام بھروسے نے لے لیا۔ دو دن کے بعد واپس کر دیا۔ بولا

"یہ میرے گلے میں چُبھتا ہے۔ مجھے چرس سے نشہ ہی نہیں ہوتا۔ اِس سے پہلے ہوتا تھا۔ دو دن سے جب سے یہ نوٹ میری جیب میں ہے مجھے نشہ ہی نہیں ہوتا! لے جاؤ سالے کو!"

رام بھروسے نے میری طرف گھور کے دیکھا۔

ننّو کا نوٹ بہت سے لوگوں میں گھوما۔ اُن میں سے کوئی ایسا نہ
تھا جسے اُسکی ضرورت نہ ہو۔ اُن میں سے کوئی امیر نہ تھا۔ کوئی بڑا
آدمی نہ تھا۔ اُن میں سے کوئی پاکباز اور متّقی نہ تھا۔ کوئی زیادہ پڑھا
لکھا نہ تھا۔ وہ سب کے سب نہایت ہی معمولی گندے اور بُری عادتوں
کے مارے ہوئے چھچھورے اور چھوٹے آدمی تھے۔ اُن سب کو ننّو کے
نوٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ نوٹ کسی نے نہ لیا۔ یہ لوگ ایک دوسرے
کی جیب سے دو آنے چُرا لیتے تھے۔ ناجائز شراب کا دھندا کرتے تھے۔
چُھپ کر چرس اور گانجا پیتے تھے۔ لڑکیوں پر غلیظ اور غیر متمدن فقرے
کستے تھے۔ اپنی بیوی کو پیٹتے تھے۔ پیٹ کے روتے تھے اور احتیاج
سے مجبور ہو کر دو دو دن تک بھوکے رہتے تھے۔ اتنا بڑا ننّو کا نوٹ
ان کی زندگی میں آیا تھا اور میں نے اب تک یہی سمجھا تھا کہ یہ لوگ
اُسے اپنے کلیجے سے لگا لیں گے۔ اُس کا ماتھا چوم لیں گے۔ دونوں ہاتھ
جوڑ کر زندگی بھر میرا احسان مانیں گے۔ مگر ہوا یہ کہ ہر جگہ سے وہ ننّو کا
نوٹ لوٹا دیا گیا۔ بلکہ میرے خلاف جوگی کو بھڑکا یا گیا۔ اور اُسے مجبور
کر دیا گیا کہ وہ مجھے اپنی کٹیا سے باہر نکال دے۔ میں نے پولیس انسپکٹر
کو ننّو کا نوٹ واپس کر دیا۔ اِسکے بعد بھی جوگی نے اپنا فیصلہ تبدیل
نہیں کیا۔

جوگی نے مجھے سات دن کی مہلت دی۔

میں نے کہا: "اب میں کہاں جاؤں۔ وہ پولیس والا میرا ہم جماعت تو اب مجھے اپنی حوالات میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا کیونکہ مون سون شروع ہو چکی ہے!

"میں نہیں جانتا" جوگی نے بڑی عاجزی سے مجھ سے کہا: "تم نہ جاؤ گے تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ اِس لئے یہی بہتر ہے کہ تم جلد سے جلد چلے جاؤ۔"

اگلے سات دنوں میں جوگی کا رویہ بیحد عجیب اور پُراسرار ہوتا گیا۔ وہ کبھی تو رونے لگتا۔ کبھی خود ہی ہنسنے لگتا۔ کبھی دن بھر منگل کی مالا جپتا۔ کبھی سارے بدن پر بھبھوت مل کر سمندر میں پہروں کھڑا رہتا۔ کبھی شراب پی کر بے سُدھ پڑا رہتا۔ اِن سات دنوں میں دو دن تک تو اُس نے دُرگا ماتا سے لڑائی مول لے لی۔ اور بالکل مندر نہیں گیا۔ اور جب گیا تو ساری رات اُس کے چرنوں میں لوٹتا رہا۔ اور گھنٹے بجا بجا کر اڑوس پڑوس کے لوگوں کی نیند خراب کرتا رہا۔

میرے جانے میں دو دن باقی تھے اور کنچن کے بیاہ میں تین دن۔ وہ رات؟ اُس رات کو بھولنا میرے لئے ناممکن ہے۔ کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا میں رنجور اور ملول کُٹیا کے اندر لیٹا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔

اب جاؤں تو کہاں جاؤں؟ اِس دُنیا میں جوگی کے پاس بھی ایک مندر ہے اور ایک کُٹیا ہے۔ اگر نہ ہوتی تو مجھے کیسے نکال سکتا۔ کسی کے پاس کچھ ہوتا ہے تو وہ اُسے وہاں سے نکال سکتا ہے نا۔ پھر میرے پاس تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میں اگر چاہوں بھی تو کسی کو کسی جگہ سے نہیں نکال سکتا۔ نکالنے کے لئے ہونا بیحد ضروری ہے۔ اور ادیب تو گویا اس ملک میں اِس قدر اپنی جگہ آزاد اور مکمل ہے کہ ہو کر بھی نہیں ہے! شخصی آزادی کا اِس سے بہتر تصوّر میرے ذہن میں بھی نہیں آسکتا۔!

میں اپنے فن کو اِسی طرح کھنگالنے میں مصروف تھا کہ پہلے تو تیز تیز قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ پھر ایک لڑکی بارش میں بھیگتی ہوئی آئی اور کُٹیا کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ جوگی گھبرا کر دروازے پر گیا۔

کنچن!

کنچن کا جواب شرمیلا کنوارا جسم اُسکی بھیگی ہوئی ساڑی میں ایک کلی کی طرح سمٹا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کنچن کو اِس حالت میں دیکھ کر جوگی کے دل میں کیا خیال آیا لیکن میرے دل میں یہ ضرور آیا۔ کیوں نہ میں آگے بڑھ کر اس کلی کو توڑ لوں۔ پتہ نہیں عورتوں اور پھولوں کو دیکھ کر یہ خیال میرے دل میں کیوں آتا ہے کہ اُنھیں توڑ لوں۔ مگر بس ایک لمحے کے لئے ہی آتا ہے۔ اِس کے بعد میں افسانے لکھنے لگتا ہوں۔ کمال ہے۔ جو

آدمی نوٹوں کا نوٹ نہیں توڑ سکتا وہ پھول کیا توڑے گا۔ پھول باغ میں بھی ہوتے ہیں۔ بازار میں بھی بکتے ہیں۔ گلدانوں میں بھی سجائے جاتے ہیں۔ بٹن ہول میں بھی لگائے جاتے ہیں —— دور سے بھی دیکھے جاتے ہیں!

—— "کنجن" —— جوگی نے استفہامیہ نظروں سے کنجن کی طرف دیکھا اُس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسرت کی چمک نمودار ہوئی۔

کنجن نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ گھبرا کر بولی۔

"ہیرا نے اپنے ایک دشمن سے شرط لگائی ہے کہ وہ اِس برساتی رات میں جب سمندر اُچھال لے رہا ہے۔ وہ کشتی لیکر جائے گا۔ دھوری گاؤں سے بھیل ٹاپو کی کھاڑی تک جائے گا۔ میں نے اُسے بہت روکا۔ بہت روکا۔ لیکن اُس نے شراب پی رکھی ہے۔ اور وہ میری نہیں سنتا۔ وہ کشتی لیکر طوفان میں جا رہا ہے۔ اور پرسوں ہماری شادی ہے!"

"پھر؟"

"مجھے بھسم دو! جوگی! مجھے بھسم دو! میرے ہیرے کو بچالو۔ وہ صبح تک اگر صحیح و سلامت واپس نہ آیا تو میں تمہاری جان لے لوں گی۔"

کنجن نے یہ جملے بڑی شدت سے ادا کئے۔ اُس کے رُخسار اور غصّے سے اُس کا چہرہ چمک کر گلنار ہو گیا تھا۔ جانے کیا بات ہے مجھے عورتیں غصّے میں بہت پیاری نازک سی اور بیحد کمزور سی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ جس قدر

غیظ و غضب میں ہوتی ہیں مجھے اُتنی ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں میں تو صرف
کنچن کو دیکھ رہا تھا۔ ہیرے سے مجھے کوئی بھی ہمدردی نہ تھی!

"مجھے بھسم دو! جوگی۔ مجھے بھسم دو! آج تک تمہاری ہر بات پُوری
ہوئی ہے۔ تمہاری بھسم میں ہر طوفان کو مطیع کر دینے کی طاقت ہے۔ مجھے
بھسم دو جوگی"

جوگی نے راکھ کی چُٹکی بھری اور کنچن کی گیلی ہتھیلی پر رکھ دی۔ گرم گرم
راکھ پانی سے لگ کر شُوں کرتی ہوئی بُجھ گئی۔ کنچن نے وفورِ جذبات سے
ہتھیلی کو اِس طرح چاٹ لیا جیسے وہ شہد چاٹ رہی ہو۔

لیکن جب کنچن چلی گئی تو جوگی بے اختیار ہو کر مندر کی طرف دَوڑا
دَوڑا گیا۔ وہ اُس وقت بالکل پاگل دکھائی دیتا تھا۔ اِس لئے میں بھی
اُس کے تعاقب میں گیا۔ جوگی تیزی سے ٹیلے پر چڑھتا گیا۔ بارش موسلادھار
برس رہی تھی۔ اور ہمارے پاؤں ٹخنوں تک کچی مٹی میں گڑے جاتے تھے۔
مگر جوگی دنیا و مافیہا سے غافل ٹیلے پر چڑھتا چلا گیا۔ مندر کے قریب پہنچ کر
اُس نے سانس لئے بغیر زور سے دروازہ کھول دیا۔ اور چلّا چلّا کر کہنے لگا۔

"ماں! آج موقع ہے! ہیرے کو طوفان میں غرق کر دو۔ ماں۔ اُسکی
کشتی کو ایسے بھنور میں ڈبو دو ماں جہاں سے وہ کبھی نہ نکل سکے۔ اُسے
سمندر کے نیچے ایسی گہری قبر میں گاڑ دو کہ ہیرے کی لاش تک نہ مل سکے۔

ماں! ماں!! تو سُنتی کیوں نہیں ہے۔ میں نے سات سال تک تیرے لئے چِلّا کاٹا ہے۔ بھوکا اور پیاسا رہا ہوں۔ در در کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قبرستانوں میں جاگا ہوں۔ کنوؤں میں اُلٹا لٹک کے تیرے نام کی اُپاسنا کی ہے۔ ماں سُن لے کنچن میری ہے۔ صرف میری ہے۔ آج رات ہیرا مر جائے گا!"

اِس کے بعد جوگی نے دُرگا ماتا کے پاؤں پکڑ لئے اور رُو رُو کے اِلتجا کرنے لگا۔

یکایک ایک کڑکا سا ہوا۔ سیاہ بادلوں میں سے بجلی کا ایک خنجر سا لپکا اور کہیں دُور سمندر کے سینے میں گھُس گیا۔

جوگی نے فاتحانہ انداز سے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر وحشیوں کی طرح چیخ کر پُر مسرّت لہجے میں کہا۔

"تو سُنتی ہے ماں! تو واقعی سُنتی ہے!! میری ماں!!"

جوگی مسرّت سے ہنسنے لگا اور زور زور کے قہقہے لگانے لگا۔

بھور ہو گئی۔

اُجلی صاف چمکیلی بھور!

ساحل پر ایک لڑکی کھڑی تھی وہ اُفق تا اُفق ننگے سمندر کو دیکھ رہی تھی ٹیلے پر مندر کے باہر ایک جوگی کھڑا تھا۔ وہ بھی سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ سمندر شانت تھا۔ دُور اُفق سے لگی ایک کشتی دکھائی دی۔ دھیرے دھیرے ساحل کی طرف آرہی تھی۔ لڑکی کا دل ہُمک کر گلے میں آگیا۔ کس کی کشتی ہے یہ؟ نزدیک آئے تو پتہ چلے۔ یوں تو دن میں درجنوں کشتیاں مچھیل ٹاپو سے ڈھوری گاؤں آتی ہیں۔ کشتی نزدیک آتی گئی۔ بادبان پھیل کر بڑے ہوتے گئے۔ سمندر کے شفیق سینے پر یہ سُبک خرام کشتی کتنی خوبصورت اور مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ لیکن لڑکی کے دل کو قرار نہ تھا۔ جب تک وہ اُسے دیکھ نہ لے۔ لڑکی نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے رُخساروں پر رکھیں اور زور سے چلّائی۔

"ہیرا! ہیرا!!"

چند لمحوں تک مکمل سکوت! جیسے کشتی میں کوئی نہ ہو۔ جیسے کشتی آپ ہی آپ چل رہی ہو۔ پھر کوئی کشتی میں اُٹھا اور زور سے چلّایا۔

"کنچن!"

کنچن دَوڑتی ہوئی پانی میں گھس گئی۔ ہیرے نے بھی کشتی سے چھلانگ لگادی۔ اور اب وہ دونوں تیرتے ہوئے سمندر کے پانی میں ایک دوسرے

سے ملنے جا رہے تھے۔ کنجن مچھلی کی طرح حسین اور بے چین۔ ہیرا سیاہ جال کی طرح خاموش اور تنا ہوا بے آواز تیزی سے آگے بڑھتا ہوا۔ لہریں شوخ اور بے تاب۔ شرارت سے مسرور اور رقصاں! یکایک ایک چیخ مار کر اور اُچھل کر ہیرے نے جھپٹا مارا اور تیرتی ہوئی کنجن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سمندر کے نیچے ڈبکی مار کر لے گیا۔ مچھلی جال میں آ گئی۔ اُبھرتے ہوئے پھوٹتے ہوئے بُلبلوں نے شور کیا۔ گھونگھے سنکھ بجانے لگے۔ سیم تن سیپیوں نے محبت کے موتی کی آرزو میں اپنے مُنہ کھول دئے اور جب سمندر کے وسیع نیلگوں شامیانے تلے سیاہ رنگ ابابیلوں نے سنہری ہنس کے ہونٹ چوم لئے تو سمندر کا سپید سپید جھاگ ساحل کے کنارے کنارے دُودھ رنگ خوشی کے قہقہے کی طرح بکھرتا چلا گیا۔ اِنسان صرف دھرتی کی اولاد ہی نہیں۔ وہ سمندر کا بھی بیٹا ہے!

بہت دیر کے بعد سمندر کے صدف سے دو موتی اُبھرے ایک ہیرا دوسری کنجن۔ ہیرے کے ایک ہاتھ میں کشتی کی رسّی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں کنجن کا ہاتھ تھا۔ اور وہ دونوں تیرتے ہوئے، چھینٹے اُڑاتے ہوئے خوشی کی دُھن میں مچاتے ہوئے ساحل کی طرف آ رہے تھے۔!

کشتی کو باندھتے وقت بھی کنجن نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا جب ہیرا کشتی کو کنارے سے باندھ چکا تو کنجن نے اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے

کہا۔ "چل مندر چلیں گے۔"

ہیرا نے کہا۔ "نہیں۔ پہلے اپنے دشمن سے مل لیں۔"

"نہیں پہلے مندر چلیں گے۔ جوگی کے چرنوں کو چھوئیں گے۔ جس نے تیری اور میری جان بچائی ہے!"

ہیرے نے قہقہہ لگایا۔ پھر اُس نے اپنی کشتی سے اُٹھا کر سورج مکھی کے ایک پھول کو کنچن کے بالوں میں لگایا۔ پھر وہ دونوں مندر کی طرف دوڑنے لگے۔

کنچن اور وہ دونوں شرط بد کر ٹیلے کے اوپر دَوڑتے جا رہے تھے۔ خوشی سے کلکاریاں مار رہے تھے۔ محبّت اُن کے دِل میں تھی۔ سُورج اُن کی آنکھوں میں تھا۔

وہ دڑاتے ہوئے مندر کے اندر چلے گئے۔ مندر کے پٹ کھُلے تھے۔ کنچن بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ مگر اُس نے ہانپتے ہوئے ہی مسرّت بھری آواز میں کہا۔

"جوگی! جوگی!!"

کنچن کی آواز سارے مندر میں گونجی اور دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

یکایک اُس کے چہرے سے مسرّت غائب ہو گئی۔ اور وہ سنجیدہ ہو

ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے آہستہ سے کہا

"جوگی! جوگی! کہاں ہو تم؟"

لیکن جوگی کہیں پر نہ تھا۔ مندر میں سنّاٹا تھا۔ پتھر کی مورتی خاموش تھی۔ شیر کے قدموں میں پُوجا کا تھال اوندھا پڑا تھا۔ لیکن جوگی کہیں نہ تھا۔ ہاں جُوگی کا سُرخ کنٹھا ماں کے پاؤں میں جھُول رہا تھا۔ اور مندر کے فرش پر ٹوٹی ہوئی منگل مالا کے منکے بکھرے پڑے تھے!!